الرسالہ

Al-Risala

July 1996 • Issue 236 • Rs. 7

بولنے سے زیادہ اہم ہے سننا، کیوں کہ
جب آپ سنتے ہیں تو آپ اپنے علم میں اضافہ کرتے ہیں۔

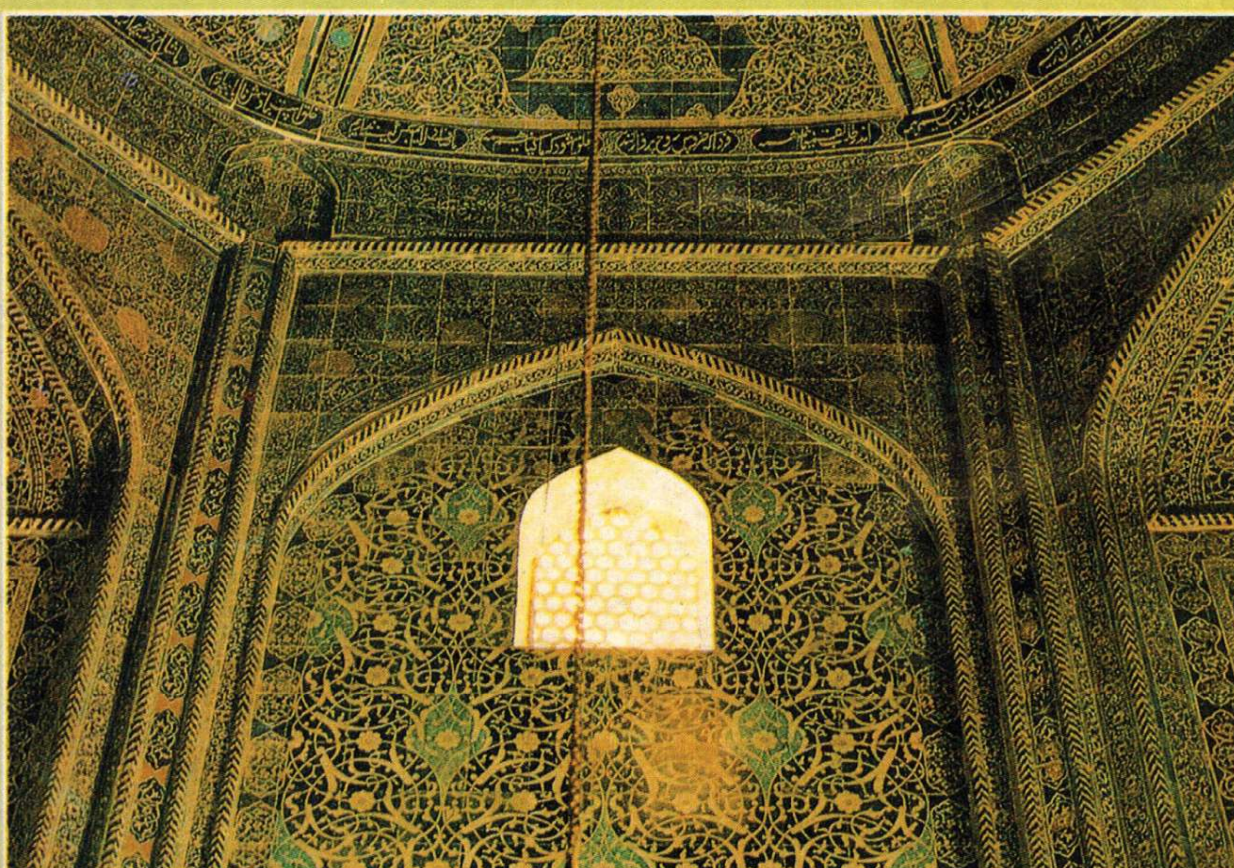

The Islamic Centre Publications

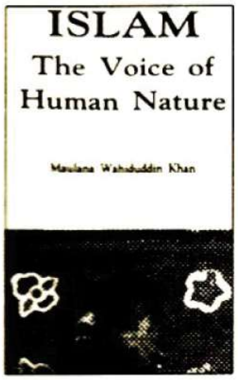

ISLAM: THE VOICE OF HUMAN NATURE

22×14.5cm, 64 pages
ISBN 81-85063-74-5
Rs. 30

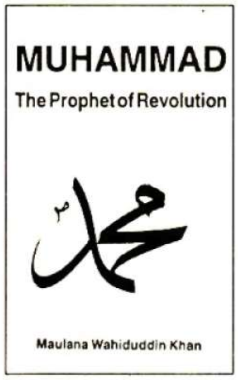

MUHAMMAD: THE PROPHET OF REVOLUTION

22×14.5cm, 228 pages
ISBN 81-85063-00-1
Rs. 85

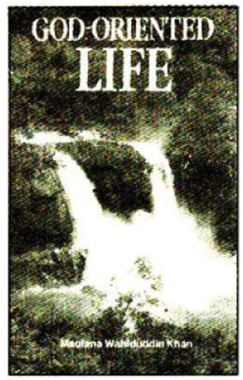

GOD-ORIENTED LIFE

22×14.5cm, 186 pages
ISBN 81-85063-97-4
Rs. 70

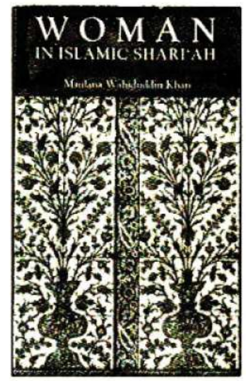

WOMAN IN ISLAMIC SHARI'AH

22×14.5cm, 150 pages
Rs. 65 (Paperback)
Rs. 185 (Hardbound)

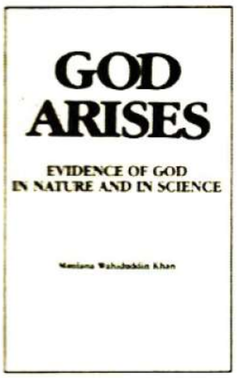

GOD ARISES

22×14.5cm, 271 pages
ISBN 81-85063-14-1
Rs. 85

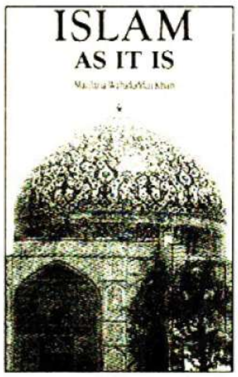

ISLAM AS IT IS

22×14.5cm, 114 pages
ISBN 81-85063-95-8
Rs. 55

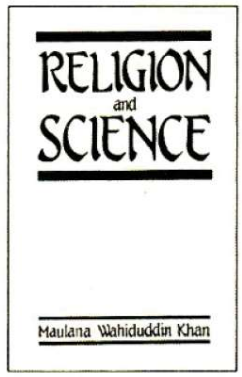

RELIGION AND SCIENCE

22×14.5cm, 96 pages
Rs. 45

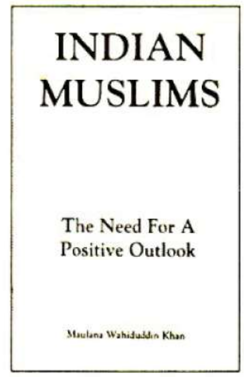

INDIAN MUSLIMS

22×14.5cm, 192 pages
Rs. 65 (Paperback)
Rs. 175 (Hardbound)

'INTRODUCTION TO ISLAM' SERIES

In this 'Introduction to Islam' series Maulana Wahiduddin Khan—a famous Islamic thinker and scholar and President of the Islamic Centre, New Delhi—has presented the fundamental teachings of Islam in a simple way. The complete series is as follows:

1. The Way to Find God (20 pages; Rs. 12)
2. The Teachings of Islam (46 pages; Rs. 15)
3. The Good Life (36 pages; Rs. 12)
4. The Garden of Paradise (36 pages; Rs. 15)
5. The Fire of Hell (44 pages; Rs. 15)

The series provides the general public with an accurate and comprehensive picture of Islam—the true religion of submission to God. In the first pamphlet it is shown that the true path is the path that God has revealed to man through His prophets. The second pamphlet provides an introduction to various aspects of the Islamic life under forty-five separate headings. Qur'anic teachings have been summarized in the third pamphlet in words taken from the Qur'an itself. In the fourth pamphlet the life that makes man worthy of paradise has been described and in the last pamphlet the life that will condemn him to hell-fire.

AL-RISALA BOOK CENTRE

1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110 013 Tel. 4611128 Fax: 11-4697333

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

جولائی ۱۹۹۶، شمارہ ۲۳۶

اعلیٰ اخلاق	۴	نیا فیصلہ	۱۱
چپ رہنا	۵	مسلمانوں کا سیاسی المیہ	۱۴
ترک تعلق	۶	کفرانِ نعمت	۱۹
درود وسلام	۷	سفرنامہ برطانیہ ــ ۲	۲۱
خود شکن بنئے	۸	خبرنامہ اسلامی مرکز ــ ۱۱۳	۴۶
شریعت کا حکم	۹		

AL-RISALA (Urdu)
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110 013, Tel. 4611128, 4697333
Fax: 91-11-4697333
Single copy Rs. 7, Annual subscription Rs. 70, Abroad: $ 20 (Air mail), $ 10 (Surface mail)
Printed and published by Saniyasnain Khan at Nice Printing Press, Delhi

اعلیٰ اخلاق

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم تمام لوگوں کے لیے اسوہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ کا اخلاق تمام امت کے لیے نمونہ ہے۔ آپ کا اخلاق کیا تھا، اس کی بابت قرآن (القلم ۴) میں ارشاد ہوا ہے کہ بلاشبہ تم ایک اعلیٰ اخلاق پر ہو (وانك لعلیٰ خلُق عظیم) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام امت کو اسی بلند اخلاق کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا :

لا تکونوا اِمّعَۃً تقولون اِن احسن الناس اَحسنّا واِن ظلموا ظلمنا ولٰکن وطّنوا انفسکم، ان احسن الناسُ اَن تُحسنوا واِن اساؤوا فلا تظلموا۔ (الترمذی)

تم لوگ امعہ نہ بنو کہ یہ کہنے لگو کہ اگر لوگ ہمارے ساتھ اچھا کریں تو ہم بھی اچھا کریں گے اور لوگ ہمارے اوپر ظلم کریں تو ہم بھی ظلم کریں گے۔ بلکہ تم اپنے آپ کو اس کے لیے آمادہ کرو کہ لوگ اچھا سلوک کریں تو تم بھی اچھا سلوک کرو اور اگر وہ برا سلوک کریں تو تم ان کے ساتھ ظلم نہ کرو۔

اچھے کے ساتھ اچھا اور برے کے ساتھ برا ——— یہ لین دین والا اخلاق ہے۔ اس قسم کے اخلاق کی اللہ کے نزدیک کوئی وقعت نہیں۔ جو آدمی اپنے عمل کی قیمت دنیا ہی میں لے لے اس نے گویا دنیا ہی میں اپنا معاملہ برابر کر لیا۔ اس کے عمل کی آخرت میں کیا قیمت ہو سکتی ہے۔ حقیقی اخلاق وہ ہے جو اعلیٰ اخلاق ہو، جو اصول کی پابندی میں برتا گیا ہو نہ کہ مفاد اور مصلحت کی پابندی میں۔

اعلیٰ اخلاق سے مراد وہ اخلاق ہے جب کہ آدمی دوسروں کے رویہ سے بلند ہو کر عمل کرے۔ اس کا طریقہ یہ نہ ہو کہ برائی کرنے والوں کے ساتھ برائی اور بھلائی کرنے والوں کے ساتھ بھلائی۔ بلکہ اخلاق اس کے لیے ناقابلِ تغیر اصول کی حیثیت رکھتا ہو۔ وہ دوسروں کے رویہ سے بے پروا ہو کر خود اپنے اصول کے تحت اپنی روش کا تعین کرے۔ وہ ہر ایک کے ساتھ بھلائی کرے، خواہ دوسرے لوگ اس کے ساتھ برا سلوک ہی کیوں نہ کر رہے ہوں۔

یہی سچا اسلامی اخلاق ہے۔ اس قسم کا اخلاق ثابت کرتا ہے کہ آپ ایک با اصول انسان ہیں۔ حالات آپ کے کردار کا تعین نہیں کرتے بلکہ خود آپ کا سوچا سمجھا اصول آپ کے کردار کا تعین کرتا ہے۔

چپ رہنا

عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من صمت نجا۔ یعنی جو شخص چپ رہا اس نے نجات پائی (مشکاۃ المصابیح ۱۳۶۰/۳) اسی طرح ایک اور روایت کے مطابق، آپ نے فرمایا: الصمتُ حکمٌ وقلیل فاعلُہ۔ یعنی خاموشی حکمت ہے۔ مگر بہت کم ہیں جو اس پر عمل کرتے ہوں (المفردات فی غریب القرآن، ۱۲۷)

خاموشی بے عملی نہیں، خاموشی خود ایک اعلیٰ ترین عمل ہے۔ انسان کی سب سے بڑی خصوصیت اس کا صاحبِ دماغ ہونا ہے۔ اور خاموشی اس بات کی علامت ہے کہ آدمی واقعۃً دماغ والا انسان ہے۔ وہ اپنے اندر ذہنی عمل کی صلاحیت رکھتا ہے۔

چپ رہنا سوچنا ہے۔ جب آدمی چپ ہو تو وہ سادہ طور پر صرف چپ نہیں ہوتا، وہ اس وقت غور وفکر میں مشغول ہوتا ہے۔ اور غور وفکر بلاشبہ سب سے بڑا عمل ہے۔ بولنا اگر اعضاء وجوارح کی حرکت کا نام ہے تو چپ رہنا دماغ کی حرکت کا نام۔ بولنا اگر آدھا عمل ہے تو چپ رہنا پورا عمل۔

چپ رہنا سنجیدگی کی علامت ہے۔ جب آدمی چپ ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ باتوں کو گہرائی کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ بولنے سے پہلے یہ سوچ رہا ہے کہ کیا بولے اور کیا نہ بولے۔ وہ دوسروں کو مخاطب بنانے سے پہلے خود اپنے آپ کو مخاطب بنا رہا ہے۔ وہ عاجلانہ اقدام کے بجائے سوچے سمجھے اقدام کا منصوبہ بنانے میں مشغول ہے۔

بولنا بے صبری ہے اور چپ رہنا صبر ہے۔ بولنا بے احتیاطی ہے اور چپ رہنا احتیاط ہے۔ بولنا غیر ذمہ دارانہ انداز ہے اور چپ رہنا ذمہ دارانہ انداز۔ بولنا محدودیت ہے۔ جو آدمی بول دے اس کی گویا حد آگئی، مگر چپ رہنا لامحدودیت ہے۔ جو آدمی چپ ہو وہ اتھاہ آدمی ہے۔ وہ ایسا آدمی ہے جس کی ابھی حد نہیں آئی۔ بولنے والا آدمی فوراً بول پڑتا ہے، اور چپ رہنے والا آدمی اس وقت بولتا ہے جب کہ تمام لوگ اپنے الفاظ ختم کر چکے ہوں۔

اسلام آدمی کے اندر خود احتسابی اور غور وفکر کا مزاج بناتا ہے۔ وہ ایسے افراد تیار کرتا ہے جو سوچنے والے ہوں، جو بولنے سے زیادہ چپ رہنے کو محبوب رکھتے ہوں۔

ترک تعلق

قطع تعلق اور ترک کلام کو اسلام میں حرام قرار دیا گیا ہے۔ حدیث کی مختلف کتابوں میں اس سلسلہ میں بہت سی روایتیں آئی ہیں۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں یہ روایت ہے کہ :

لا یحل للرجل أن یھجر اخاہ فوق ثلاث لیال، یلتقیان فیُعرض ھذا ویعرض ھذا۔ وخیرھما الذی یبدأ بالسلام۔

کسی آدمی کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ ترک تعلق کرے۔ دونوں ملیں تو ایک اِدھر منہ پھیر لے اور دوسرا اُدھر منہ پھیر لے۔ اور دونوں میں بہتر وہ ہے جو سلام کرنے میں پہل کرے۔

ایک روایت میں ہے کہ ہر دوشنبہ اور جمعرات کو جنّت کے دروازے کھولے جاتے ہیں۔ پھر ہر اس بندہ کو بخش دیا جاتا ہے جس نے اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرایا ہو سوا اس آدمی کے جس کی اپنے بھائی کے ساتھ عداوت ہو۔ کہا جاتا ہے کہ ان دونوں کے بارہ میں انتظار کرو، یہاں تک کہ وہ آپس میں اپنے تعلق کو درست کرلیں (مسلم)

ایک روایت کے مطابق ایک صحابی کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ جو شخص اپنے بھائی سے ایک سال تک تعلق توڑے رہے تو وہ اس کا خون بہانے کے برابر ہے (ابوداؤد) سنن ابوداؤد میں ایک اور روایت اس طرح ہے :

لا یحلُّ لمسلم ان یھجرَ اخاہ فوق ثلاث۔ فمن ھجر فوق ثلاث فمات دخل النار۔ (سنن ابی داؤد ۴/۲۸۱)

کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ ترک تعلق کرے۔ پس جو شخص تین دن سے زیادہ ترک تعلق کرے اور اسی حال میں مرجائے تو وہ آگ میں داخل ہوگا۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی کسی سے غصہ ہو کر اس سے تعلق توڑ لیتا ہے اور اس سے بولنا بند کردیتا ہے۔ یہ برائی مردوں میں بھی ہے اور عورتوں میں بھی۔ مگر یہ سخت گناہ ہے۔ وہ اتنا زیادہ سنگین ہے کہ آدمی اپنی اصلاح نہ کرے اور اسی حالت میں اس پر موت آجائے تو نماز روزہ کے باوجود سخت اندیشہ ہے کہ وہ خدا کی پکڑ میں آجائے گا۔

درود وسلام

قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ـــــ بے شک اللہ اور اس کے فرشتے رسول پر صلاۃ (درود) بھیجتے ہیں۔ اے ایمان والو، تم بھی اس پر درود اور سلام بھیجو (الاحزاب ۵۶) علماء نے لکھا ہے کہ اللہ کی صلاۃ (درود) رسولؐ پر رحمت بھیجنا ہے۔ فرشتوں کا درود استغفار کرنا ہے اور اہل ایمان کا درود دعا کرنا ہے۔

نبی پر درود وسلام کے بارے میں تفسیروں اور حدیث کی شرحوں میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اس پر بہت سی مستقل کتابیں بھی موجود ہیں۔ مثلاً شیخ شمس الدین سخاوی کی کتاب القول البدیع فی الصلاۃ علی الحبیب الشفیع، وغیرہ۔

حدیث (النسائی، الترمذی) میں ہے کہ وہ شخص بخیل ہے جس کے سامنے میرا ذکر کیا جائے اور وہ مجھ پر درود نہ پڑھے (البخیلُ مَن ذُکِرتُ عندہ فلم یُصَلِّ علیّ) حقیقت یہ ہے کہ پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنا آپ کے احسان عظیم کا شکر ادا کرنا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تاریخ کا عظیم ترین کارنامہ انجام دیا۔ آپ نے انسانی تاریخ کو نزاعی نبوت کے دور سے نکال کر تسلیم شدہ نبوت کے دور میں پہنچایا۔ دین توحید کو تحریف کے دور سے نکال کر محفوظ دین کے دور میں پہنچایا۔ انسانی تمدن کو توہمات کے دور سے نکال کر سائنسی دور میں پہنچایا۔ خدا کے کلمہ کو مغلوبیت کے دور سے نکال کر غلبہ کے دور میں پہنچایا۔ شریعت الٰہی کو غیر کامل دور سے نکال کر کامل دور میں پہنچایا۔ دین حق کو غیر تاریخی دور سے نکال کر تاریخی دور میں پہنچایا، وغیرہ۔

یہ تاریخ کا سب سے بڑا اور سب سے مشکل مشن تھا۔ اس مشکل ترین مشن میں آپؐ کے ساتھ آپ کے اصحاب اور آپ کے اہل خاندان نے ہر وہ قربانی پیش کی جو اس کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے درکار تھی۔ اس لیے حکم دیا گیا کہ قیامت تک تمام لوگ رسولؐ پر اور اس مقدس جماعت پر درود وسلام بھیج کر اس کے احسانِ عظیم کا اعتراف کریں۔

جب کوئی شخص کسی کے اوپر احسان کرے تو انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ اس پر شکر کا اظہار کیا جائے۔ درود وسلام اسی قسم کے ایک عظیم ترین احسان کا دعا کی صورت میں اعتراف ہے۔ اللّٰھُم صلّ علیٰ سیّدنا محمّد وعلی وآلہ وصحبہ وسلم۔

خود شکن بنئے

سبکتگین ایک ترکی غلام تھا، سامانی (ایرانی) حکمرانوں نے اس کو غزنہ (افغانستان) کا گورنر بنایا۔ بعد کو حالات سے فائدہ اٹھا کر اس علاقہ میں اس نے اپنی آزاد حکومت قائم کرلی۔ وہ ۹۷۷ء سے لے کر ۹۹۷ء تک اس غزنوی سلطنت کا حکمراں رہا۔

سبکتگین کے بعد اس کا لڑکا اس سلطنت کا حکمراں بنا جو محمود غزنوی (۹۷۱-۱۰۳۰) کے نام سے مشہور ہے۔ اس نے ۱۰۲۴ء میں پہلی بار سومناتھ (گجرات) پر حملہ کیا۔ اس نے سنا تھا کہ یہاں شیو کا مندر ہے اور اس کے اندر بڑی مقدار میں سونا موجود ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ مندر کو توڑ کر اس کا سونا حاصل کرے۔

اس سے پہلے ۱۰۰۱ء میں محمود غزنوی نے پشاور کے قریب راجہ جیپال کا مقابلہ کیا تھا۔ اس وقت محمود غزنوی کے پاس صرف پندرہ ہزار فوجی تھے۔ اس کے مقابلہ میں راجہ جیپال کے فوجیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی، حتیٰ کہ اس کے پاس ۳۰۰ ہاتھی بھی تھے۔ مگر محمود غزنوی نے اس مقابلہ میں زبردست کامیابی حاصل کی۔ اس کی وجہ سے لوگوں کے اوپر اس کا ایک فوجی رعب قائم ہوگیا۔

چنانچہ محمود غزنوی جب اپنے لشکر کو لے کر سومناتھ پہنچا تو یہاں کے پنڈتوں نے اس سے مل کر یہ پیش کش کی کہ آپ ہمارے مندر کو نہ توڑیں۔ اس کے بدلے میں ہم آپ کو بڑی مقدار میں سونا، چاندی پیش کر دیں گے۔ محمود غزنوی نے اس کے جواب میں کہا: من بت شکنم نہ بت فروش۔ یعنی میں بت کو توڑنے والا ہوں نہ کہ بت کو بیچنے والا۔

محمود غزنوی نے اپنے آپ کو اسلام کے نمائندہ کی حیثیت سے پیش کیا۔ مگر اس کے اس فعل کا کوئی تعلق اسلام سے نہ تھا۔ بت شکنی اسلام کا کوئی اصول نہیں۔ اسلام اپنے ماننے والوں کو خود شکن بناتا ہے نہ کہ بت شکن۔ اور کسی مندر کا یا کسی بھی ادارہ کا خزانہ لوٹنا تو اس سے بھی زیادہ برا ہے، کیوں کہ وہ سراسر حرام ہے۔

خود شکن بننا یہ ہے کہ آدمی خواہش کے پیچھے نہ چلے بلکہ اصولِ حق کا اتباع کرے۔ وہ کبر کی نفسیات سے اوپر اٹھے اور تواضع کا طریقہ اختیار کرے۔ وہ ذاتی مفاد کے بجائے انصاف کو اہمیت دے۔ وہ خود پرست کے بجائے خدا پرست بن جائے۔

شریعت کا حکم

اسلامی شریعت کا ایک متفقہ مسئلہ ہے : المشقة تجلب التیسیر (مشقت آسانی کا موجب ہوتی ہے۔) یعنی جب کسی شرعی حکم پر عمل کرنا مشقت کا باعث ہو تو ایسے حالات میں خود شرعی حکم کو نرم کر دیا جاتا ہے، نہ یہ کہ حالات کو نظر انداز کرتے ہوئے ہر قیمت پر شریعت کی تعمیل پر اصرار کیا جائے۔

مثال کے طور پر ایک مسلمان پر حج کی عبادت فرض ہو چکی ہے، مگر اس کے لئے حج کے سفر کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ کسی وجہ سے خطرناک ہو گیا ہے تو ایسی حالت میں یہ حکم نہیں دیا جائے گا کہ تم جان و مال کا خطرہ مول لے کر حج کے لئے نکلو، بلکہ خود حج کا فریضہ اس کے اوپر سے ساقط ہو جائے گا۔ اسی طرح ایک شخص مرض میں مبتلا ہے۔ نماز کا وقت آیا اور اس پر نماز کی ادائیگی فرض ہو گئی لیکن اندیشہ ہے کہ اگر وہ پانی سے وضو کرے گا تو اس کا مرض بڑھ جائے گا۔ ایسی حالت میں اس سے یہ نہیں کہا جائے گا کہ تم جان پر کھیل کر وضو کرو۔ بلکہ اس سے کہا جائے گا کہ تم مٹی سے تیمم کر کے اپنی نماز ادا کر لو۔ اسی طرح ایک شخص بھوکا ہے اور وہ ایسے حالات میں ہے کہ وہاں خنزیر کے گوشت کے سوا کوئی اور چیز اس کے لئے قابل حصول نہیں۔ اس وقت اس سے شریعت کا مطالبہ یہ نہیں ہو گا کہ خواہ تم بھوک سے مر جاؤ مگر حرام گوشت کا کوئی ٹکڑا اپنے منھ میں مت ڈالو۔ اس کے برعکس ایسے مضطر شخص کے لئے خنزیر کے گوشت کو کھانا جائز قرار دیدیا جائے گا۔ وغیرہ۔

شریعت کا ہر حکم استطاعت کے ساتھ مشروط ہے (التغابن ۱۶) اسی کو حدیث میں ان الفاظ میں فرمایا کہ: اذا امرتکم بامر فأتو منه ما استطعتم (بخاری و مسلم)، یعنی جب میں تم کو کوئی حکم دوں تو اس میں سے جتنا تمہارے بس میں ہو اتنا کرو۔

یہ شریعت کا ایک نہایت اہم اصول ہے اور اس کا تعلق زندگی کے تمام معاملات سے ہے۔ مگر موجودہ زمانہ کے علما، اس اصول کو صرف جزئی مشقتوں پر منطبق کرتے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں شاید کوئی بھی عالم نہیں جو اس شرعی اصول کو بڑی بڑی مشقتوں کے معاملہ میں چسپاں کرتا ہو۔

موجودہ زمانہ میں اس کوتاہی کا بے پناہ نقصان مسلمانوں کے حصہ میں آیا ہے۔

مثلاً موجودہ زمانہ میں تقریباً ہر مسلم علاقہ میں "سیاسی انقلاب" کے نام سے تحریکیں چلائی جا رہی ہیں۔ ان تحریکوں کا براہ راست ٹکراؤ حکومت وقت سے ہوتا ہے۔ حکومت وقت ان تحریکوں کو اپنے لئے سیاسی خطرہ سمجھ کر ان پر پابندی لگاتی ہے۔ اس کے بعد تحریکوں کے علمبردار تشدد پر اتر آتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حکومت اپنی طاقت کو استعمال کرکے ان تحریکوں کو کچلنا شروع کر دیتی ہے۔ یہ واقعہ آج دنیا کے تقریباً ہر حصہ میں مختلف صورتوں میں پیش آ رہا ہے۔ مگر موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے صرف ایک ہی کام کر رہے ہیں، اور وہ شکایت اور احتجاج ہے۔ وہ تحریک چلانے والے لوگوں کو کچھ نہیں کہتے۔ البتہ حکمرانوں کو اسلام دشمن قرار دے کر رات دن وہ ان کی مذمت میں مشغول ہیں۔

یہ طریقہ واضح طور پر اسلامی شریعت کے خلاف ہے۔ جب شریعت یہ کہتی ہے کہ جس حکم پر عمل کرنا مشقت کا باعث ہو رہا ہو وہ عمل مسلمانوں سے رفع کر دیا جاتا ہے۔ ایسی حالت میں مذکورہ نوعیت کی تباہ کن سیاست کا مطلب اپنے آپ کو ایک ایسے حکم کا مکلف بنانا ہے جس کا مکلف شریعت نے ان کو نہیں کیا۔

جب یہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ مشقت کے موقع پر شریعت حکم کو آسان کر دیتی ہے تو یہی اصول اس سیاسی معاملہ میں بھی اپنایا جائے گا جس طرح وہ عبادت اور اکل و شرب کے معاملہ میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اس حکم کا تعلق جس طرح عبادت سے ہے اسی طرح جہاد سے بھی ہے۔

آج اگرچہ ہر ملک میں یہ صورت حال ہے کہ حکمرانوں سے سیاسی ٹکراؤ کرنے میں مشقت پیش آ رہی ہے، مگر عین اسی وقت ہر ملک میں غیر سیاسی میدان میں کام کرنے کے مواقع پوری طرح کھلے ہوئے ہیں۔ مثلاً تعلیم و تربیت، معاشی تعمیر، اصلاح معاشرہ، دعوت و تبلیغ، وغیرہ۔ اس طرح کے بہت سے نہایت قیمتی کام ہیں جو غیر سیاسی میدان میں کئے جا سکتے ہیں۔ اور ان کو کرنے میں کسی مشقت کا کوئی اندیشہ نہیں۔ ایسی حالت میں جو لوگ مسلمانوں کو تباہ کن ٹکراؤ کے راستہ پر لے جا رہے ہیں اور ان کو تعمیر کے میدان میں کھلے مواقع کے استعمال کی طرف راغب نہیں کرتے وہ یقیناً شریعت سے انحراف کر رہے ہیں نہ کہ شریعت کی تعمیل۔

نیا فیصلہ

مراد آباد مغربی یوپی کا ایک صنعتی شہر ہے۔ یہاں کافی تعداد میں مسلمان بستے ہیں۔ حال میں دو دن کے لئے میں مراد آباد گیا تھا وہاں ایک تقابلی واقعہ میرے علم میں آیا جس میں بہت بڑا اسبق ہے۔

اس سے پہلے ۱۳ اگست ۱۹۹۰ کو مراد آباد میں ایک واقعہ ہوا تھا۔ اس کے بعد شہر میں فرقہ وارانہ فساد ہوگیا۔ قصہ یہ تھا کہ مراد آباد کی عید گاہ ایک نالے کے عین کنارے ہے۔ اس کی وجہ سے یہاں اکثر خنزیر گھومتے رہتے ہیں۔ ۱۳ اگست کو عید کا دن تھا۔ عید گاہ کے وسیع میدان میں مسلمان چادریں بچھا کر نماز ادا کر رہے تھے۔ نماز کے بعد خطبہ شروع ہوا تو ایک خنزیر عید گاہ کے اندر گھس آیا۔ وہ جب گزرا تو کچھ مسلمانوں کی چادریں گندی ہوگئیں۔ اس پر مسلمان بپھر اٹھے۔ پہلے ان کا ٹکراؤ پولیس سے ہوا جو قریب ہی کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے بعد اس نے ہندو مسلم فساد کی صورت اختیار کرلی۔ زبردست جانی و مالی نقصان ہوا۔ تقریباً چار مہینے تک شہر میں کرفیو لگا رہا۔ اس کے نتیجہ میں یہاں کا ایکسپورٹ بزنس تباہ ہوگیا۔ یہاں تک کہ اس کو دوبارہ بحال کرنے میں پانچ سال لگ گئے۔

اس واقعہ کے سولہ سال بعد اسی مراد آباد میں دوسرا برعکس واقعہ پیش آتا ہے۔ ۴ مارچ ۱۹۹۶ کو ہولی کا دن تھا۔ یہاں کے ایک بازار میں جہاں دونوں فرقہ کے لوگوں کی دکانیں ہیں ہولی کے دن ایسا ہوا کہ ایک غیر مسلم نے رنگ سے بھری ہوئی بالٹی اٹھا کر پھینکی۔ بالٹی کا رنگ پورا کا پورا سامنے کی ایک مسلم دکان میں جا پڑا۔ دکان کا فرش ہولی کے رنگ سے رنگین ہوگیا۔

پچھلے مسلم مزاج کے اعتبار سے یہ ایک اشتعال انگیز واقعہ تھا۔ مگر مسلم دکاندار اس پر مشتعل نہیں ہوئے۔ انھوں نے سادہ طور پر صرف یہ کیا کہ دکان بند کرکے اپنے گھر چلے گئے۔ اس کے بعد دکان کا فرش بدل دیا گیا۔ ایک ایسا واقعہ جو فرقہ وارانہ فساد برپا کرنے کے لئے کافی تھا وہ خاموشی کے ساتھ گزر گیا۔ نہ کسی کا نقصان ہوا اور نہ بازار کی سرگرمیوں میں کوئی خلل پڑا۔

یہ کوئی منفرد واقعہ نہیں۔ آج ایسے واقعات تقریباً ہر مقام پر پیش آرہے ہیں۔ یہ مسلمانوں کے بدلے ہوئے موڈ کو بتاتے ہیں۔ یہ مسلمان پہلے جن واقعات پر بھڑک اٹھتے تھے اب انھوں

نے ایسے واقعات کو نظر انداز کرنے کا فن سیکھ لیا ہے، اور یہ بلا شبہ ان کے لئے اور سارے ملک کے لئے نہایت مفید علامت ہے۔

آزادی (۱۹۴۷) کے بعد مسلمان اس ملک میں مطلوب ترقی نہ کرسکے۔ اس کی وجہ صرف ایک تھی، اور وہ عدم تحفظ کی وہ صورت حال تھی جس میں وہ مسلسل اپنے آپ کو پا رہے تھے۔ انھوں نے اپنے نااہل لیڈروں اور دانشوروں کی غلط رہنمائی کے نتیجہ میں یہ سمجھ لیا تھا کہ ایسا اس لئے ہے کہ ملک کا ایڈ منسٹریشن ان کے حق میں متعصب ہے۔ چوں کہ مسلمان دیکھ رہے تھے کہ ایڈمنسٹریشن اس معاملہ میں ان کی امیدیں پوری نہیں کر رہا ہے اس لئے وہ اس کے خلاف احتجاج کرنے لگے اور جب احتجاج سے بھی مقصد پورا نہیں ہوا تو وہ مایوسی کا شکار ہو گئے۔

مگر یہ سوچ بجائے خود غلط تھی۔ پولیس اور ایڈ منسٹریشن کی بھی اسی طرح ایک حد ہے جس طرح ہر معاملہ کی ایک حد ہوتی ہے۔ وہ حد یہ ہے کہ پولیس اور ایڈ منسٹریشن وہاں کام کرتے ہیں جہاں معاملہ انفرادی ہو۔ جب کوئی معاملہ عمومی یا عوامی بن جائے تو وہاں پولیس اور ایڈ منسٹریشن اس کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے۔

دو قومی نظریہ اور دوسرے مختلف اسباب سے اس ملک میں یہ ہوا ہے کہ ہندو اور مسلمان نفسیاتی اعتبار سے دو متقابل گروہ بن گئے ہیں۔ نااہل لیڈروں نے اپنی مسلسل نادانیوں سے دونوں میں اس اعتبار سے حساسیت بہت بڑھا دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مسلمان اور ایک ہندو کے درمیان جب جھگڑے کا کوئی واقعہ ہوتا ہے تو فوراً ہی بڑھ کر وہ دو فرقہ کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ یہی وہ غیر معتدل صورت حال ہے جس نے اس معاملہ میں پولیس اور ایڈ منسٹریشن کو بے بس بنا دیا ہے۔ جہاں اس نوعیت کی نزاکت نہ ہو وہاں جب دو آدمیوں میں نزاع ہوتی ہے تو وہ دو فرد یا زیادہ سے زیادہ دو خاندان کی نزاع ہوتی ہے۔ ایسی نزاع کو کنٹرول کرنا پولیس اور ایڈ منسٹریشن کے لئے آسان ہوتا ہے۔ مگر جب مذکورہ قسم کے حالات ہوں تو ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ دو آدمیوں کی نزاع فوراً پھیل کر دو فرقوں کی نزاع بن جاتی ہے۔ اس توسیع کی بنا پر وہ مسئلہ پولیس اور ایڈ منسٹریشن کے اختیار سے باہر کا مسئلہ بن جاتا ہے یہی خاص وجہ ہے جس کی بنا پر مسلمانوں کے بے شمار احتجاج اور شکایت کے باوجود ایڈ منسٹریشن

کے لئے اس کو کنٹرول کرنا ممکن نہ ہوسکا۔

مرادآباد کا واقعہ (اور اس طرح کے دوسرے واقعات) بتاتے ہیں کہ اب مسلمانوں نے اس حقیقت کو دریافت کرلیا ہے کہ اس مسئلہ کا حل خود ان کے پاس موجود ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ نزاعی موقع پر تحمل کا طریقہ اختیار کرکے وہ معاملہ کو اول مرحلہ ہی میں ختم کردیں اور اس کی نوبت ہی نہ آنے دیں کہ وہ پھیلے اور دو فرد کے بجائے دو فرقہ کا مسئلہ بن جائے۔

ہر سماج میں نزاعی واقعات پیش آتے ہیں۔ یہ خود فطرت کے نظام کی بنا پر ہے نہ کہ کسی کی سازش کی بنا پر۔ اس لئے یہاں ایسے واقعات کا پیش آنا بالکل بند نہیں ہوسکتا۔ جو چیز بند ہوسکتی ہے وہ یہ کہ مسلمان ایسے مواقع پر مشتعل ہونا چھوڑ دیں۔ اس طرح چنگاری پہلے ہی مرحلہ میں بجھ جائے گی۔ وہ پھیل کر دو فرقوں کا تباہ کن مسئلہ نہیں بنے گی جیسا کہ مرادآباد میں ہولی کے معاملہ میں پیش آیا۔

کسی بھی ترقی کے لئے امن لازمی طور پر ضروری ہے۔ مسلمان چوں کہ اشتعال انگیزی کے مواقع پر بھڑک اٹھتے تھے اس لئے فساد کی نوبت آجاتی تھی اور امن کی فضا بار بار بھنگ ہوجاتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ استقلال کے ساتھ کسی ترقیاتی کام میں مصروف ہونا ان کے لئے ناممکن ہوگیا تھا۔

اب نئے حالات ملک میں وہ معتدل فضا فراہم کررہے ہیں جس کو امن کی فضا کہا جاتا ہے۔ اس بنا پر مسلمانوں کے لئے تعمیر و ترقی اور تعلیم و تجارت جیسے کاموں میں سرگرم ہونا ممکن ہوگیا ہے۔ پچھلے چند سال میں ملک کے مختلف علاقوں کے سفر کے دوران میں نے پایا ہے کہ مسلمانوں میں واضح تبدیلی آئی ہے۔ وہ اعراض کا اصول اختیار کرکے نہایت تیزی کے ساتھ تعمیری میدانوں میں سرگرم ہوتے جارہے ہیں۔

اس طرح ہندستان کے مسلمانوں میں ایک نیا آغاز ظہور میں آچکا ہے۔ اور صحیح آغاز ہمیشہ صحیح انجام تک پہنچتا ہے۔ یقینی ہے کہ اس ملک کے مسلمان اب تیزی سے ترقی کریں گے۔ اور ان کی ترقی ملک کی مجموعی ترقی میں اضافہ کا ذریعہ بنے گی۔ یہاں تک کہ یہ محسوس کیا جانے لگے گا کہ مسلمان اس ملک کے لئے بوجھ (liability) نہیں ہیں بلکہ وہ اس ملک کا سرمایہ (asset) ہیں۔ وہ ملک کی آبادی کا ایک تخلیقی حصہ ہیں نہ کہ کوئی جامد یا غیر مفید حصہ۔

مسلمانوں کا سیاسی المیہ

ہندستان میں مسلمان اتنی بڑی تعداد میں ہیں کہ وہ پارلیمنٹ کی تقریباً سو سیٹوں کے انتخابی حلقہ میں فیصلہ کن بن سکتے ہیں۔ وہ اس ملک میں توازنی طاقت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ امکانی طور پر وہ اس پوزیشن میں ہیں کہ الکشن میں وہ کسی سیاسی پارٹی کو ہرائیں اور کسی پارٹی کو کامیاب بنادیں۔

مگر حیرت ناک بات یہ ہے کہ مسلمان ہی وہ فرقہ ہیں جو اس ملک میں سب سے زیادہ سیاسی محرومی کا شکار ہیں۔ ذاتی طور پر بعض مسلم افراد کچھ اتفاقات سے فائدہ اٹھا کر کوئی سیاسی منصب ضرور حاصل کر لیتے ہیں۔ مگر بحیثیت مجموعی مسلم ملت کا اس ملک میں کوئی سیاسی مقام نہیں۔ نہ ملک کی سیاست میں ان کا کوئی دخل ہے اور نہ باہر کے مسلم ممالک سے سیاسی تعلقات قائم کرنے میں ان کا کوئی حصہ ہے۔ حتی کہ اس ملک میں مسلمانوں کو اتنا سیاسی مقام بھی حاصل نہیں جتنا سیاسی مقام سری لنکا جیسے چھوٹے ملک کی مسلم اقلیت نے حاصل کر لیا ہے۔

مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے عام طور پر اس کی ذمہ داری دوسروں پر (بالفاظ دیگر ہندوؤں پر) ڈالتے ہیں۔ مگر میں اس کو بالکل بے بنیاد سمجھتا ہوں۔ اس دنیا میں خود خدا کے قانون کے تحت، چھننا اور ملنا، دونوں کے اسباب ہمیشہ داخل میں ہوتے ہیں نہ کہ خارج میں۔ اس قسم کی کوئی توجیہہ بداہتہً ہی قابل رد ہے۔ کیوں کہ وہ قانون فطرت کے سراسر خلاف ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس المناک صورت حال کی تمام تر ذمہ داری مسلمانوں کے نا اہل لیڈروں پر ہے۔ مسلمان دراصل خود اپنے نکمے لیڈروں کے نکمے پن کی قیمت ادا کر رہے ہیں۔ کیوں کہ انھوں نے مسلمانوں کے درمیان صرف سطحی سیاستیں چلائیں۔ انھوں نے مسلمانوں کے اندر صحیح سیاسی شعور پیدا نہیں کیا جو اس اعتبار سے کرنے کا اصل کام تھا۔

اگر آپ الکشن کے زمانہ میں کسی شہر میں نکلیں تو آپ کو سب سے زیادہ الکشنی دھوم مسلمانوں کے محلہ میں دکھائی دے گی۔ ہندو محلے یا دوسرے فرقوں کے محلے نسبتاً الکشنی ہنگاموں سے خالی نظر آئیں گے۔ یہ واقعہ علامتی طور پر بتاتا ہے کہ مسلمانوں کی وہ کون سی غلطی ہے جس نے

انھیں اس ملک میں سیاسی محرومی کے مسئلہ سے دوچار کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ نااہل مسلم لیڈروں کی غلط رہنمائی کے نتیجہ میں وہ الکشن کے زمانہ میں دھوم مچانے کو سیاست میں حصہ لینا سمجھتے ہیں۔ حالانکہ سیاست میں حصہ لینا حقیقۃً یہ ہے کہ وہ ملک کے سیاسی عمل میں بھرپور شرکت کریں۔

مسلمان اگر روزہ کے زمانہ میں سحری اور افطار اور لاؤڈ اسپیکر کی دھوم مچائیں تو اس سے انھیں تقویٰ کا کریڈٹ نہیں مل سکتا۔ تقویٰ کا انعام لینے کے لئے ضروری ہے کہ پورے سال بھر متقیانہ زندگی گزاری جائے۔ ٹھیک اسی طرح الکشن کے چند مقرر دنوں میں انتخابی سرگرمیاں دکھانے سے انھیں ملک میں کوئی سیاسی درجہ نہیں مل سکتا۔ ملک میں سیاسی درجہ حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ مستقل طور پر ملک کے سیاسی عمل میں شرکت کی جائے اور اس میں بھرپور طور پر اپنا حصہ ادا کیا جائے۔

اس کی مثال لیجئے۔ ۱۹۴۷ سے لے کر اب تک میں نے ہزاروں اجتماعات اور جلسوں میں شرکت کی ہے۔ اس پوری مدت میں میں نے مسلمانوں کا کوئی ایک بھی قابل ذکر اجتماع نہیں پایا جہاں ملک کے مسائل زیر بحث لائے جائیں۔ ملک کے قومی اشوز مسلمانوں کے دائرۂ بحث سے تقریباً خارج ہیں۔ ہر مسلم جلسہ میں صرف ملی مسائل، زیادہ صحیح لفظ میں ملی شکایات پر تقریریں ہوتی ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قومی اشوز مسلمانوں کا کنسرن (concern) ہی نہیں۔

دوسری طرف ہندوؤں کے جلسوں میں بار بار میں نے پایا کہ وہ خالص ملکی مسائل پر بولتے ہیں۔ وہ قومی اشوز پر اظہار خیال کرتے ہیں۔ حتی کہ ہندوؤں کے منظم کئے ہوئے کسی اجتماع میں اگر کوئی مسلمان آجائے تو میں نے دیکھا وہ وہاں بھی فوراً مسلم فرقہ کی شکایات کو لے کر بیٹھ جاتا ہے۔ یہ مثال بتاتی ہے کہ مسلمان اس ملک کے سیاسی عمل میں سرے سے شامل ہی نہیں ہیں۔

سیاسی عمل میں شریک ہونے کی دوسری صورت بالواسطہ شرکت کی ہے۔ مثلاً مسلمانوں کے پاس ایسے اخبارات ہوں جو پورے ملک میں پڑھے جاتے ہوں۔ ٹریڈ یونین کے اداروں میں ان کا کوئی مؤثر عمل دخل ہو۔ اس طرح کے مختلف ادارے ہیں جو بالواسطہ طور پر سیاست کے عمل پر گہرا اثر رکھتے ہیں۔ مگر مسلمان ان اداروں میں موجود ہی نہیں۔ مسلمانوں کے تمام اخبارات، اگر ان کو اخبار کہا جا سکے، تو وہ صرف ملی شکایت نامے ہیں۔ قومی صحافت سے

ان کا کوئی تعلق ہی نہیں ۔ ٹریڈ یونین ازم کا حال تو یہ ہے کہ اس کا تصور تک مسلمانوں میں پایا نہیں جاتا ، وغیرہ۔

پچھلے پچاس سال میں نام نہاد مسلم لیڈروں کی رہنمائی میں مسلمانوں نے سیاسی عمل کے نام سے جو کچھ کیا ہے ، وہ یہ ہے کہ آزادی کے بعد ایک عرصہ تک وہ بس کانگرس کو ووٹ دیتے رہے ۔مگر اس پوری مدت میں کانگرس کے تنظیمی ڈھانچہ میں شرکت کے لئے انھوں نے کوئی کوشش نہیں کی۔ اس کے بعد جب انھیں کانگرس سے مایوسی ہوئی تو انھوں نے منفی ووٹنگ کا طریقہ اختیار کیا۔ اب انھوں نے ہر اس پارٹی کو ووٹ دینا شروع کیا جو کانگرس کے خلاف شور وغل کر رہی ہو۔ یہ سلسلہ تا دم تحریر جاری ہے ۔

میں سمجھتا ہوں کہ مسلمان اگر یہ چاہتے ہیں کہ وہ ملک میں اپنا جائز سیاسی مقام حاصل کریں۔ تو سب سے پہلے انھیں ملک کے سیاسی عمل میں شریک ہونا پڑے گا۔ اس کے بعد ہی وہ کوئی حقیقی انتخابی منصوبہ بنا سکتے ہیں یا ملک کے انتخابات میں شریک ہو کر کوئی قابل ذکر فائدہ حاصل کر سکتے ہیں۔

اس سلسلہ میں مسلمانوں کے پاس طاقت ور قومی صحافت ہونا بہت ضروری ہے۔ موجودہ زمانہ میں جس گروہ کی صحافت نہیں ، اس کی کوئی سیاست بھی نہیں۔ تاہم قومی صحافت اس طرح وجود میں نہیں آسکتی کہ " قومی اخبار " کے نام سے ایک روزنامہ جاری کر دیا جائے۔ اس کے لئے مسلمانوں کو صنعت کے میدان میں آنا ہوگا۔ موجودہ زمانہ میں صنعت ہی وہ ادارہ ہے جو اخبارات کو غذا دیتا ہے۔ بڑی صنعتوں میں جب تک مسلمانوں کا کوئی قابل ذکر حصہ نہیں ہوگا، اس وقت تک ان کی کوئی قابل ذکر صحافت بھی وجود میں نہیں آسکتی۔

قومی صحافت کے میدان میں مسلمانوں کی پس ماندگی یا ان کی عدم نمائندگی اس نوبت کو پہنچی ہے کہ وہ اس آخری امکان کو بھی استعمال نہ کر سکے جو خود اپنی صحافت نہ ہونے کے باوجود اب بھی انھیں حاصل تھا۔ وہ ہے موجودہ بڑے بڑے اخبارات میں جاری قومی بحثوں میں حصہ لینا۔ میں بیشتر بڑے بڑے قومی اخبارات کو دیکھتا ہوں ۔ مگر ان میں جب بھی کہیں کوئی مسلم نام ہوتا ہے تو پیشگی طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ کسی نہ کسی اعتبار سے ملی شکایت یا ملی احتجاج کی نوعیت کی کوئی تحریر ہوگی ۔ ان اخبارات کے مضامین یا خطوط کے کالم میں کبھی کبھی مسلمانوں کے

نام دکھائی دیتے ہیں۔ مگر وہ ہمیشہ کسی نہ کسی کے خلاف مسلم ردعمل کے ہم معنی ہوتے ہیں۔ وہ ملک کے قومی سیاسی عمل میں مسلمانوں کی شرکت کے ہم معنی نہیں ہوتے۔

دوسری ضروری بات یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر صحیح نوعیت کا سیاسی شعور پیدا کیا جائے۔ انھیں بتایا جائے کہ ردعمل یا منفی ووٹ کا نام سیاست نہیں ہے بلکہ مثبت سیاسی کردار ادا کرنے کا نام سیاست ہے۔

مسلمانوں کو جاننا چاہئے کہ الکشن کے موقع پر ایک پارٹی کو ہرانا اور دوسری پارٹی کو جتانا، یہ کوئی سیاست نہیں ہے، یہ تو بس ایک قسم کی سیاسی اچھل کود ہے۔ اس قسم کی سیاسی اچھل کود سے مسلمانوں کا سیاسی معاملہ نہ درست ہوا ہے اور نہ آئندہ کبھی درست ہونے والا ہے۔

مسلمانوں کو ملک کی سیاسی فضا میں اپنے مثبت وجود کا احساس دلانا ہوگا۔ انھیں ملک کے اندر جاری سیاسی عمل میں فعال طور پر شریک ہونا پڑے گا۔ انھیں قومی سطح پر یہ ثابت کرنا ہوگا کہ ملک کی سیاسی ترقی میں ان کی حصہ داری نہایت اہمیت رکھتی ہے۔ مثلاً مغربی ایشیا کے مسلم ملکوں اور ہندستان کے درمیان اچھے تعلقات قائم کرنے کے لئے وہ ایک اہم کڑی بن سکتے ہیں یا بین اقوامی تنظیموں میں شامل مسلم ممالک کا تعاون ہندستان کے حق میں لینے کے لئے وہ مفید کردار ادا کر سکتے ہیں۔ وغیرہ۔

مگر موجودہ صورت حال کے باقی رہتے ہوئے ان میں سے کوئی بھی چیز ہمارے لئے ممکن نہیں۔ مثال کے طور پر مسلمانوں کے رہنما، خواہ وہ بے ریش ہوں یا باریش، جب مسلم ملکوں یا عرب ملکوں میں جاتے ہیں تو ان میں سے ہر ایک بلا استثنا، یہ کرتا ہے کہ ان ملکوں میں وہ ہندستان کی منفی تصویر پیش کرتا ہے۔ وہ ہندستان کو ایک مسلم مخالف ملک کے طور پر پروجیکٹ کرتا ہے۔ اس ناعاقبت اندیشانہ روش کو جاری رکھتے ہوئے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ ان مسلم ملکوں کو ہندستان کے حق میں کسی سیاسی تعاون پر آمادہ کر سکیں جس کا وزن ہندستان میں عمومی طور پر محسوس کیا جائے اور نتیجۃً ملک میں مسلمانوں کے درجہ کو بڑھانے والا ثابت ہو۔

ہندستان کے مسلمان اگر اس قسم کا بین اقوامی رول ادا کریں، جو یقینی طور پر ممکن ہے، تو

اچانک وہ دیکھیں گے کہ ملک کے اندر ان کی تصویر بدل گئی ہے۔ اس کے بعد وہ اِس ملک میں بوجھ نہیں سمجھے جائیں گے بلکہ وہ ملک کا قومی اور سیاسی اثاثہ بن جائیں گے۔ اور جس دن ایسا ہوگا اسی دن اس ملک میں مسلمانوں کے لئے شاندار سیاسی مستقبل کا آغاز ہو جائے گا۔

ہندستان میں بلاشبہ مسلمانوں کے لئے ایک عظیم سیاسی مستقبل کی تعمیر کے امکانات پوری طرح موجود ہیں۔ مگر اس سیاسی مستقبل کو پانے کا راز الکشن میں کسی کے موافق یا کسی کے خلاف ووٹ دینے میں نہیں ہے۔ اس کا راز خود اپنی شعوری اور سیاسی اصلاح میں ہے۔ اس کے اسباب مسلمانوں کے اپنے اندر ہیں نہ کہ ان کے باہر۔

اس وقت ملک کے تعلیم یافتہ طبقہ میں ہر جگہ یہ بحث چھڑی ہوئی ہے کہ ملک کا قومی ایجنڈا کیا ہو۔ اس کے لئے میٹنگیں ہو رہی ہیں۔ ہندی اور انگریزی اخبارات میں کثرت سے مضامین چھپ رہے ہیں۔ مستقل کتابیں لکھی جا رہی ہیں۔ مگر ان سرگرمیوں میں مسلمان کہیں دکھائی نہیں دیتے۔ اس پورے معاملہ سے وہ تقریباً غیر متعلق ہیں۔

مسلمانوں کے اخبارات میں یا ان کے اجتماعات میں اکثر اس موضوع پر بحث ہوتی ہے کہ مسلمانوں کی اپنی سیاسی جماعت بنائی جائے۔ مگر اس قسم کی فرقہ وارانہ سیاسی جماعت مسلمانوں کے مسائل میں صرف اضافہ کرنے والی ہے۔ اصل ضرورت یہ ہے کہ مسلمان قومی سیاسی جماعتوں میں شریک ہوں۔ وہ ان کے تنظیمی ڈھانچہ میں شامل ہو کر اپنے آپ کو وہاں پہنچائیں جہاں سیاسی معاملات پر فیصلے کئے جاتے ہیں۔

اس وقت مسلمان اس ملک میں صرف ایک شکایتی گروہ کی حیثیت سے نظر آتے ہیں۔ مثبت معنوں میں وہ ایک سیاسی وجود کی حیثیت سے کہیں دکھائی نہیں دیتے، نہ فکری مجالس میں اور نہ عملی سرگرمیوں میں۔ مسلمان اگر اس خلا کو پر کر سکیں اور پوری طرح ملک کے سیاسی عمل (پولٹیکل پراسس) میں شامل ہو جائیں تو مجھے یقین ہے کہ وہ اس ملک کے لئے ایک سیاسی سرمایہ بن سکتے ہیں حتیٰ کہ وہ وقت آئے گا جب کہ وہ اس ملک میں پرائم منسٹر کا عہدہ حاصل کر لیں۔

کفرانِ نعمت

پانی کے ایک گلاس سے لیکر حکومت اور سیاسی اقتدار تک جو کچھ اس دنیا میں کسی کو حاصل ہے وہ سب اللہ کی طرف سے ہے۔ ہر چیز براہ راست اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے۔ اس دنیا میں جو کچھ بھی کسی کو ملتا ہے وہ اللہ کے چاہنے سے ملتا ہے، اللہ نہ چاہے تو کچھ بھی کسی کو نہیں مل سکتا، خواہ وہ بطور خود اس کے لئے کتنا ہی زور مارے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو قرآن و حدیث سے دو اور دو چار کی طرح ثابت ہے۔

دوسری چیز جو قرآن و حدیث سے معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ خدائی عطیہ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک خصوصی عطیہ۔ اور دوسرے عمومی عطیہ۔ خصوصی عطیہ کو آجکل کی زبان میں سیاسی اقتدار کہا جاسکتا ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ سیاسی اقتدار ہر ایک کو نہیں دیا جاتا۔ اور نہ وہ پولٹیکل تحریک یا گن کلچر چلاکر کسی کو حاصل ہوتا۔ اس کا تعلق براہ راست سنت اللہ سے ہے۔ اس سنت اللہ میں سے ایک یہ ہے کہ جو گروہ حقیقی معنوں میں ایمان اور عمل صالح کا ثبوت دے اس کے لئے سیاسی اقتدار کا فیصلہ کر دیا جائے (النور ۵۵) گویا اقتدار مطلوب ہو تب بھی اس کے لئے ایمان اور عمل صالح کی تحریک چلانا ہے نہ کہ سیاسی ہنگامہ آرائی کا معرکہ جاری کرنا۔

اس کے بعد خدا کا عمومی عطیہ وہ ہے جو کم و بیش ہر ایک کے حصہ میں آتا ہے۔ یہ اصولی طور پر دو قسم کی چیزوں پر مشتمل ہے ——— پرامن حالات اور حصول رزق کی آسانی۔ یہ بات قرآن کی مندرجہ ذیل آیت سے معلوم ہوتی ہے:

وضرب اللہ مثلا قریۃ کانت آمنۃ مطمئنۃ یاتیہا رزقہا رغدا من کل مکان فکفرت بانعم اللہ فاذاقہا اللہ لباس الجوع والخوف بما کانوا یصنعون

(النحل ۱۱۲)

اور اللہ ایک بستی والوں کی مثال بیان کرتا ہے کہ وہ امن اور اطمینان میں تھے۔ ان کو ان کا رزق فراغت کے ساتھ ہر طرف سے پہنچ رہا تھا۔ پھر انھوں نے خدا کی نعمتوں کی ناشکری کی تو اللہ نے ان کو ان کے اعمال کے سبب سے بھوک اور خوف کا مزہ چکھایا۔

اس آیت میں دو چیزوں کو انعم اللہ (خدا کے انعامات) کہا گیا ہے ۔ اس سے معلوم ہوا کہ دو ہی چیزیں ہیں جو دینوی اعتبار سے انسان کے لئے ضروری ہیں ۔ ایک امن اور دوسرے رزق ۔ اگر یہ دو چیزیں کسی گروہ کو حاصل ہو جائیں تو اس کے بعد اس کو کسی اور چیز ، مثلاً پولٹیکل اقتدار کے لئے جنگ نہیں چھیڑنا چاہئے ۔ بلکہ ان نعمتوں کو کافی سمجھتے ہوئے اللہ کی شکرگزاری میں لگ جانا چاہئے ۔ تاآنکہ اللہ خود بقیہ چیزوں کے حصول کی راہ ہموار کر دے ۔

اللہ کی شکرگزاری کیا ہے ۔ وہ یہ ہے کہ جو کچھ اللہ نے دیا ہے اس کا دینی اور تعمیری استعمال ۔ ملے ہوئے پر قانع رہ کر اللہ کی یاد میں لگ جانا شکرگزاری ہے ، اور اگر ملے ہوئے کو نظرانداز کر کے نہ ملے ہوئے کے لئے دھوم مچائی جائے تو اسی کا نام ناشکری ہوگا ۔

جس مسلم گروہ کو امن اور رزق کی نعمت مل جائے ، اس کے بعد اس کو ربانی سرگرمیوں میں مصروف ہونا چاہئے نہ کہ پولٹیکل سرگرمیوں میں ۔ اب اس کو یہ کرنا ہے کہ اپنے اندر ایمانی حرارت پیدا کرے ۔ اپنے درمیان اخلاقی اصلاح کی تحریکیں اٹھائے ۔ اپنی نسلوں کو تعلیم یافتہ بنانے کی مہم شروع کرے ۔ اللہ کے پیغام کو تمام قوموں تک پہنچانے کا نظام بنائے ۔ وہ اپنی عبادت گاہوں کو آباد کرے ۔ وہ اپنے علمی اداروں کو ترقی دے ۔ وہ اپنی بستیوں کو نمونہ کی بستی بنا دے ۔ وغیرہ ۔

یہی سچی شکرگزاری ہے ۔ یہ اللہ کی نعمتوں کا حق ادا کرنا ہے ۔ غیر مومن کی نگاہ اپنے حقوق پر ہوتی ہے ۔ اور مومن کی نگاہ اپنی ذمہ داریوں پر ۔ اسی لئے غیر مومن ہمیشہ نہ ملے ہوئے کو پانے کی طرف دوڑتا ہے ۔ اور مومن ہمیشہ ملے ہوئے کے اندر اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں لگ جاتا ہے ۔

جو لوگ شکرگزاری کے اس طریقہ پر نہ چلیں ، اس کے بجائے وہ سیاسی تحریکوں کی دھوم مچائیں یا وہ مفروضہ دشمنوں کے خلاف گن کلچر کو زندہ کریں ، وہ بلاشبہ سرکش لوگ ہیں ۔ ان کا کیس سرکشی کا کیس ہے ، خواہ وہ اپنی تحریک کو اسلام یا دین مصطفیٰ کے نام پر کیوں نہ چلا رہے ہوں ۔

ایسے لوگوں کے بارہ میں اللہ کا فیصلہ ہے کہ وہ نہ صرف یہ کہ اپنی سیاسی منزل تک نہیں پہنچیں گے ، بلکہ امن اور رزق کی جو نعمتیں ان کو ملی ہوئی تھیں ان سے بھی وہ محروم ہو جائیں گے ۔ وہ ملے ہوئے کو بھی کھو دیں گے ، اور رہا نہ ملے ہوئے کو پانا تو ان کے لئے مقدر ہی نہیں ۔ یہی اس معاملہ میں سنت اللہ ہے ۔

پھر میں نے کہا کہ مذہبی اختلاف کا تعلق صرف ہندو اور مسلمان سے نہیں ہے۔ یہ اختلافات خود ہندوؤں اور ہندوؤں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ مثلاً ہندوؤں کا ایک طبقہ بتوں کی پرستش کو صحیح مذہب سمجھتا ہے، دوسرا طبقہ بت پرستی کو بالکل غلط بتاتا ہے اور اس کا کھنڈن کرتا ہے۔ اس طرح کے بے شمار اختلافات ہندوؤں کے درمیان پائے جاتے ہیں۔ پھر ہندو اگر باہمی اختلاف کے باوجود مل کر رہ سکتے ہیں تو ہندو اور مسلمان باہمی مذہبی اختلاف کے باوجود مل کر کیوں نہیں رہ سکتے۔ میں نے کہا کہ اس معاملہ کا فیصلہ بہت عمدہ طور پر سوامی ویویکانند نے کر دیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ایک کی پیروی کرو اور دوسروں سے نفرت نہ کرو:

Follow one and hate none.

انھوں نے آپ کی تجویز کے مطابق یہ نہیں کہا کہ: .Follow one and believe in all یعنی ایک کی پیروی کرو اور سب کو سچ مانو۔ گویا اصل چیز دوسرے مذہبوں کو سچا ماننا نہیں ہے بلکہ دوسرے مذہبوں کو ہیٹ نہ کرنا ہے۔ اسی اصول پر ساری دنیا کا نظام چل رہا ہے اور اسی اصول پر ہندستان کا نظام بھی چلے گا۔

لندن میں پاکستان کے لوگ بڑی تعداد میں رہتے ہیں۔ ایک تعلیم یافتہ پاکستانی نے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے قول کو دہرایا کہ "پاکستان اسلام کے نام الاٹ ہو چکا ہے"۔ انھوں نے کہا کہ پاکستان اسلام کے لئے بنایا گیا اور پاکستان میں اسلام کا نظام ہی قائم ہوگا۔ کسی دوسرے نظام کو یہاں چلنے نہیں دیا جائے گا۔

میں نے کہا کہ کوئی خطۂ ارض اسلامی نظام نہیں بناتا بلکہ انسان اسلامی نظام بناتے ہیں۔ اس معاملہ میں پہلی غلطی اورنگ زیب نے کی۔ انھوں نے بڑا زمینی خطہ حاصل کرنے کے لئے لڑائیاں کیں تاکہ اس میں ایک عظیم اسلامی ایمپائر بنایا جاسکے۔ مگر جب زمینی خطہ مل گیا تو معلوم ہوا کہ اسلامی ایمپائر بنانے کے لئے اصل ضرورت انسان کی ہے۔ چوں کہ اورنگ زیب کے پاس مطلوب انسان موجود نہ تھے اس لئے خطۂ ارض مل جانے کے باوجود مطلوبہ اسلامی سلطنت نہ بن سکی۔ اس قسم کی بھیانک غلطی ایک بار کافی تھی۔ مگر پاکستان کے مفکرین نے یہی غلطی دوبارہ کی۔ انھوں نے ایک زمینی ٹکڑا حاصل کرنے کے لئے پورے برصغیر کے مسلمانوں کو تہ و بالا کر دیا۔ اور آخر میں معلوم ہوا کہ یہاں

اسلامی نظام نہیں بن سکتا۔ کیوں کہ اس کے لئے ضروری انسانی ٹیم موجود نہیں ہے۔

روزانہ میں کمرہ ہی میں صبح کا ناشتہ کرتا تھا۔ یکم اگست کو ناشتہ کے لئے میں ہوٹل کے مطعم میں چلا گیا۔ وہاں اتفاق سے منوبھائی مادھوانی اپنی اہلیہ کے ساتھ موجود تھے۔ وہ بھی آکر میری میز پر بیٹھ گئے۔ ہم لوگوں نے ساتھ ہی ناشتہ کیا۔

مادھوانی پریوار سب کا سب نہایت سادہ اور متواضع ہے۔ خاندان کے تمام افراد ہر وقت مشارکین کی خدمت میں لگے رہتے ہیں۔ حالانکہ مسٹر مادھوانی یہاں کے ارب پتی افراد میں سے ہیں۔ انھوں نے ہندستانی معیار سے تین کرور روپیہ اس کانفرنس کے لئے دیا ہے۔ میں نے منوبھائی مادھوانی سے پوچھا کہ آپ بزنس کے میدان میں ہیں، یہ بتائیے کہ بزنس میں کامیابی کا راز کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ میرے باپ ہم لوگوں کو تین بات بتایا کرتے تھے :

1. Money is not your wealth. Your people are your wealth
2. When there is a will there is a way.
3. Be firm and kind, God will give you.

میں نے پوچھا کہ "پیپل" کو آپ کس طرح تیار کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں صرف یہی کام کرتا ہوں۔ میں نہ بنک جاتا اور نہ آفس میں بیٹھتا۔ میں مختلف دیشوں میں گھومتا رہتا ہوں اور کام کے آدمی تلاش کرتا ہوں۔ خاص طور پر نوجوانوں میں۔ جہاں کوئی نوجوان مجھے کام کا نظر آیا، میں اس کو فوراً اٹھا لیتا ہوں اور پھر اس کو پورا چانس دیتا ہوں۔

میں نے پوچھا کہ آدمیوں کے انتخاب میں آپ کا اندازہ غلط بھی ثابت ہوتا ہوگا۔ پھر اس کی شرح اب تک کیا رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ مشکل سے تین فیصد۔ انھوں نے کہا کہ میری کوشش سب سے زیادہ یہ ہوتی ہے کہ اچھا منیجر تلاش کروں۔ میرا کام بہت سے دیشوں میں پھیلا ہوا ہے۔ جدہ (سعودی عرب) میں بھی ہمارا آفس ہے، مگر یہ سارا کام میرے منیجر چلا رہے ہیں۔ ایک بات انھوں نے یہ بتائی کہ میں اپنے رشتہ داروں کو کبھی نہیں لیتا۔ میں ہمیشہ خاندان سے باہر کے آدمی کا انتخاب کرتا ہوں۔ یہ میرا مستقل اصول ہے۔

یکم اگست کو میری تقریر تھی۔ میں نے کہا کہ آج کی دنیا کو سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ امن ہے اور امن روحانی ترقی (spiritual uplift) کے ذریعہ حاصل ہوسکتا ہے۔

پھر میں نے بتایا کہ انسان پیدائشی طور پر ایک روحانی مخلوق ہے۔ اس لئے انسان کو روحانی بنانا نہیں ہے۔ بلکہ اس کی روحانیت کو بچانا ہے۔ اس دنیا میں بار بار آدمی کے ساتھ ناخوشگوار واقعات پیش آتے ہیں۔ بار بار اس کو زیادتی کا تجربہ ہوتا ہے۔ اس قسم کے واقعات آدمی کے اندر منفی جذبات ابھارتے ہیں جو روحانیت کو بھنگ کرنے والے ہیں۔

ایسی حالت میں اپنی پیدائشی روحانیت کو باقی رکھنے کا راز صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ آدمی منفی چیزوں کو مثبت چیزوں میں تبدیل کر سکے۔ ہم میں سے ہر ایک کو یہی فن سیکھنا ہے۔ عام طور پر میری تقریر کو پسند کیا گیا۔ گنگوتری کے سوامی جی نے کہا: ایسا لگتا تھا کہ ہر دے کو بھاشا مل رہی ہو۔

میرے بعد چیف جتھیدار پروفیسر منجیت سنگھ کی تقریر ہوئی۔ انھوں نے ایک قصہ سنایا کہ کچھ عیسائی برنارڈ شا کے پاس آئے۔ انھوں نے گلیلیو کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اس نے یہ کہا تھا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔ مگر چرچ نے اس کو سزا دی کیوں کہ یہ نظریہ چرچ کے عقیدہ سے ٹکراتا تھا۔ برنارڈ شا نے کہا کہ گلیلیو نے جھوٹ کہا۔ لوگوں نے پوچھا کیوں، برنارڈ شا نے جواب دیا: جس سیارہ پر برنارڈ شا پیدا ہوا ہو وہ بھلا کسی اور سیارہ کا سٹلائٹ ہوسکتا ہے۔ یہ ایک طنز تھا۔ برنارڈ شا کا مطلب یہ تھا کہ لوگ اپنی ذات سے سچائی کو ناپتے ہیں۔ وہ اس سچائی کا انکار کر دیتے ہیں جس میں ان کے خیال کے مطابق، ان کا اپنا قد چھوٹا ہو رہا ہو۔

جلسہ کے دوران مجھے ٹائیلٹ جانے کی ضرورت پیش آئی۔ ایک صاحب نے رہنمائی کر کے باہر پہنچایا۔ یہاں پنڈال سے متصل خوبصورت کیبن کی صورت میں بہت سے باتھ روم کھڑے کئے ہوئے تھے۔ یہ سب جدید طرز کے نہایت صاف ستھرے باتھ روم تھے۔ اس میں بھی ہندستان اور انگلینڈ کا فرق نمایاں طور پر دکھائی دیا۔

یکم اگست کی شام کو ہوٹل کے لان میں شامیانہ کے تحت ایک میٹنگ (ورک شاپ) ہوئی۔ اس کا موضوع جین ازم تھا۔ منی جی چید انند سرسوتی نیویارک سے آئے تھے۔ انھوں نے جین ازم کے تعارف پر ایک تقریر کی۔ اس کے بعد سوال وجواب ہوا۔

حاضرین میں سے ایک ہندو نے سوال کیا کہ آپ لوگ اہنسا کو مطلق (absolute) مانتے ہیں۔ آپ کے نزدیک یدھ کسی بھی حال میں جائز نہیں۔ مگر ہندو ٹریڈیشن کے مطابق رام اور کرشن دونوں

نے یدھ کیا۔ پھر ان کے بارہ میں آپ کا کیا خیال ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ یہ مذہب کے نام پر اکسپلائیٹیشن تھا۔ میٹنگ کے بعد ایک نشست میں ایک ہندو بھائی نے اس پر سخت تنقید کی۔ اس پر گنگوتری سے آئے ہوئے سوامی جی نے کہا: وہ تو ایسا ہی کہیں گے۔ کیوں کہ ان کے گرنتھوں میں لکھا ہوا ہے کہ رام اور کرشن دونوں نرک میں گئے۔

ایک اور نوجوان نے سوال کیا کہ جین ازم کے مطابق، ایک آدمی مر رہا ہو تو اس کو اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہئے۔ اس کو کھانا پانی کچھ نہیں دینا چاہئے۔ کیوں کہ وہ اپنے کرم کو بھوگ رہا ہے۔ اس کے جواب میں منی جی نے کہا کہ یہ ایک فرقہ (sect) کا نظریہ ہے، وہ سارے جینیوں کا نظریہ نہیں۔ میٹنگ کے درمیان کچھ عورت اور مرد اٹھ کر جانے لگے تو انھوں نے مقرر کی طرف رخ کر کے دونوں ہاتھ جوڑے۔ اس طرح گویا جھک کر معافی مانگی۔ پھر باہر چلے گئے۔

میٹنگ کے بعد میں اپنے کمرہ میں آیا تو ایک ہندو نوجوان مجھ سے ملنے کے لئے اپنے ماں باپ کے ساتھ آئے ہوئے تھے۔ ماں باپ کو شکایت تھی کہ وہ ایک مسلم لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اور اس نے ہندو دھرم کو چھوڑ کر اسلام قبول کر لیا ہے۔ ماں باپ اس پر بہت دکھی تھے۔ اس لئے وہ نوجوان کو مجھ سے ملانے کے لئے لائے تھے۔

میں نے کہا کہ اسلام اگر آپ نے اس لئے قبول کیا ہے کہ وہ آپ کو صحیح نظر آیا تو بہت اچھی بات ہے۔ لیکن اگر آپ نے مسلم لڑکی سے شادی کے لئے اسلام قبول کیا ہے تو اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ انھوں نے کہا کہ پہلے تو میں نے شادی کی غرض سے اسلام کو اختیار کیا تھا۔ مگر اب میرا اس پر یقین ہو چکا ہے۔ حتی کہ اگر مسلم لڑکی میرا ساتھ چھوڑ دے تب بھی میں اسلام کو چھوڑنے والا نہیں۔ ان کو قرآن کی سورتیں ابھی یاد نہیں ہوئی ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ میں انگریزی میں نماز پڑھتا ہوں۔ اگرچہ پانچوں وقت کی نماز کی پابندی ابھی وہ نہیں کر رہے ہیں۔

۲ اگست کی صبح کو ابھی میں بستر پر تھا کہ باہر سے کوے کے بولنے کی آواز آئی۔ آنکھ کھول کر کھڑکی سے دیکھا تو اجالا شروع ہو چکا تھا۔ اٹھ کر فجر کی نماز پڑھی۔ دہلی میں بھی اسی طرح ہر روز صبح کو کوے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ چڑیوں کا جو طریقہ ہندستان میں ہے وہی انگلینڈ میں ہے۔ چڑیاں ہر جگہ یکساں کردار ادا کر رہی ہیں۔ انسان کو بھی فطرت کے اسی راستہ کو اختیار کرنا تھا۔ مگر انسان بار بار نفس

PROGRAMME OF SPEAKERS AND WORKSHOPS/ CULTURAL PROGRAMME (subject to change)

DAY	SPEAKER	THEME	INTRODUCTION BY:	WORKSHOP 6.30-8.30 p.m.
Saturday, 30th July	His Excellency Dr. L.M. Singhvi	Keynote address	n/a	none
	Shree Maganbhai Bhimajiani	Welcome speech	n/a	
	Mr. Manubhai M. Madhvani	Welcome speech	n/a	
	Sant Shree Morari Bapu	Recital		
Sunday, 31st July	Gurudev Shree Chitrabhanuji	Spiritual lecture	Dr L.M. Singhvi	**Sikhism**
	H.H. Pramukh Swami Maharaj	Spiritual lecture	Dr L.M. Singhvi	Professor Sardar Manjit Singhji
	Sant Shree Morari Bapu	Recital		Dr Mo.inder Singh
Monday, 1st August	Maulana Wahiduddin Khan Saheb	Spiritual lecture	Dr L.M. Singhvi	**Jainism**
	Professor Sardar Manjit Singhji	Spiritual lecture	Dr L.M. Singhvi	Gurudev Shree Chitrabhanuji
	Sant Shree Morari Bapu	Recital		Dr Sadhvi Sadhnaji
Tuesday, 2nd August	Dr. Sadhvi Sadhnaji	Spiritual lecture	Shrimati Kamla Singhvi	**Islam**
	Swami Chidanand Saraswati (Muniji)	Spiritual lecture	Mr Manubhai Madhvani	Maulana Wahiduddin Khan Saheb
	Sant Shree Morari Bapu	Recital		
Wednesday, 3rd August	Sant Shree Rameshbhai Oza	Spiritual lecture	Muniji	**Youth Question & Answer**
	Shree Krishna Shanker Shastri	Spiritual lecture	Shree Maganbhai Bhimajiani	Sant Shree Rameshbhai Oza
	Sant Shree Morari Bapu	Recital		Muniji and Dr K.L. Seshagiri Rao
Thursday, 4th August	Most Venerable Dr M.Vajiragnana	Spiritual lecture	Mathoor Krishnamurthi	Shree Krishna Shanker Shastri
	Rev. Marcus Braybrook	Spiritual lecture	Mathoor Krishnamurthi	Goswami Indira Betiji
	Sir Sigmund Sternberg	Spiritual lecture	Mathoor Krishnamurthi	
	Sant Shree Morari Bapu	Recital		
Friday, 5th August	Goswami Indirabetiji	Spiritual lecture	Sant Shree Rameshbhai Oza	All Sants: Question & Answer
	Prof. Vidyaniwas Mishra	Spiritual lecture	Dr L.M. Singhvi	on Unity
	Sant Shree Morari Bapu	Recital		
Saturday, 6th August	Sant Shree Rameshbhai Oza	Spiritual lecture	Dr L.M. Singhvi	Bhajan programme
	The Most Rev.Trevor Huddlestone	Spiritual lecture	Dr L.M. Singhvi	
	Dr L.M. Singhvi	Spiritual lecture	Mr Manubhai Madhvani	
	Sant Shree Morari Bapu	Recital		
Sunday, 7th August	Swami Satyamitranand Giriji	Spiritual lecture	Muniji	Purnahoti
	Brahma Kumari Dadi Jankiji	Spiritual lecture	Muniji	
	Sant Shree Morari Bapu	Recital		

کی خواہشوں کے زیر اثر آجاتا ہے۔ انسان اگر اپنے کردار کو اصولِ فطرت کے تابع رکھے تو اس کا کردار بھی ہمیشہ اور ہر جگہ یکساں رہے گا۔ مگر انسان اصول کے بجائے مفاد کی پیروی کرنے لگتا ہے اس بنا پر اس کے کردار میں یکسانیت باقی نہیں رہتی۔

باپو جی کی کتھا کا طریقہ یہ تھا کہ وہ گوسوامی تلسی داس کی رامائن کے حصے روزانہ گاکر پڑھتے ہیں اور درمیان میں اس کی تشریح کرتے ہیں۔ تشریح میں اکثر چٹکلے اور قصہ کہانیاں ہوتی ہیں جن کو سن کر لوگ کبھی قہقہہ لگاتے ہیں اور کبھی تالیاں بجاتے ہیں۔ کبھی جوش میں آکر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

تلسی داس کی رامائن مغل دور میں ہندی میں لکھی گئی۔ قدیم رامائن والمیکی کی ہے جو سنسکرت میں ہے۔ ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ والمیکی کی یہ رامائن ماقبل تاریخ دور میں اٹھارہ لاکھ سال پہلے تیار ہوئی۔ وہ مہابھارت کا واقعہ پیش آنے سے بھی پہلے لکھی گئی تھی۔ بعد کو اس کے پیشگی بیان کے مطابق عین اسی طرح مہابھارت کا واقعہ پیش آیا۔ انسائیکلو پیڈیا آف ہندوازم جس کو ساڑھے پانچ سو ہندو اہل علم نے تیار کیا ہے وہ اسی قسم کی باتوں سے بھری ہوئی ہے۔ یہاں کے ایک سیکولر ہندو نے کہا: انسائیکلو پیڈیا آف ہندوازم کے لئے میری صرف ایک ترمیم ہے، اس کا نام بدل کر انسائیکلو پیڈیا آف ہندو مائتھالوجی رکھ دیا جائے۔

ہندستان میں کچھ مسلمان نہایت اخلاص کے ساتھ اسلام اور ہندوازم میں مماثلت ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس طرح اسلامی دعوت کی راہ کھلے گی۔ مگر یہ سراسر نادانی کی سوچ ہے۔ اصل ضرورت یہ ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ہر قیمت پر نفرت اور کشیدگی کا خاتمہ کر دیا جائے تاکہ دونوں کے درمیان معتدل فضا میں اختلاط ہونے لگے۔ اس اختلاط کے دوران فطری طور پر دونوں میں آزادانہ ڈائیلاگ جاری ہو جائے گا۔ اور اسی ڈائیلاگ کے تقابلی نتیجہ کا نام دعوت ہے۔

۲ اگست کو صبح کے ناشتہ میں ایک صاحب نے اکال تخت کے جتھے دار صاحب سے کہا: پنجاب کا مسئلہ تو اب ختم ہو گیا۔ انھوں نے کہا کہ باہر ختم ہو گیا، لیکن اندر اندر موجود ہے۔ پالی ٹیشین اس کو ختم نہیں ہونے دیں گے۔ اگر یہ مسئلہ ختم ہو جائے تو ان کے پاس کوئی اشو باقی نہیں رہے گا۔ وہ اپنے آپ کو سیاسی موت سے بچانے کے لئے عوام کو تباہی کے گڑھے میں ڈالے ہوئے ہیں۔ سیاسی

لیڈروں کی اسی پالیسی کی وجہ سے دیش کھنڈ کھنڈ ہو رہا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ میں منی پور (آسام) گیا وہاں میں بازار میں تھا کہ ایک شخص نے پوچھا کہ آپ کیا انڈیا سے آرہے ہیں :

Are you coming from India?

گویا کہ انڈیا ایک الگ ملک ہے۔ وہ اپنے کو انڈین نہیں کہتے۔ علیحدگی پسندی کی یہ ذہنیت ملک کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ لوگ پیسہ کمانے میں اتنا زیادہ مشغول ہیں کہ وہ کسی اور چیز کے لئے بہت زیادہ سنجیدہ نہیں ہو پاتے۔

برطانیہ میں لڑکوں اور لڑکیوں کا مسئلہ بہت عام ہے۔ اکثر والدین اس مسئلہ سے پریشان ہیں۔ ایک روز ایک نوجوان مرد اور ایک نوجوان عورت مجھ سے ملنے کے لئے آئے۔ عورت مسلمان تھی اور مرد ہندو۔ دونوں شادی کرنا چاہتے تھے۔ مگر دونوں کے والدین نے مخالفت کی۔ اس لئے دونوں ہی کو اپنے والدین کے گھر کو چھوڑ دینا پڑا۔ اب دونوں کہیں الگ رہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہم کو ایک دوسرے سے لو (Love) ہو گیا ہے۔ مگر ہمارے پیرنٹ ہم کو میرج کی اجازت نہیں دے رہے ہیں۔ آپ بتائیے کہ ہم کیا کریں۔

میں نے کہا کہ زندگی میں اصل چیز لو نہیں ہے، اصل چیز نباہ ہے۔ لو کا تعلق جذبات سے ہوتا ہے اور نباہ کا تعلق عقل سے۔ اگر لو اصل چیز ہوتی تو نہ آپ اپنے ماں باپ کو چھوڑتے اور نہ یہ خاتون اپنے ماں باپ کو چھوڑتیں۔ پھر جب اولاد اور والدین کی خونی محبت ٹوٹ گئی تو میاں بیوی کی غیر خونی محبت کیسے نہیں ٹوٹے گی۔ ہزاروں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں لو میرج کا طریقہ اختیار کر کے تباہ ہو چکے ہیں، پھر آپ کیوں اسی آزمائے ہوئے راستہ کو دوبارہ آزمانا چاہتے ہیں۔

ڈاکٹر ایل ایم سنگھوی اس وقت لندن میں انڈیا کے ہائی کمشنر ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ اس سے پہلے جب میں واشنگٹن میں انڈیا کے سفیر کی حیثیت سے تھا تو مجھے معلوم ہوا کہ امریکہ کے مسلمانوں میں بریلوی اور دیوبندی کا جھگڑا ہے۔ انھوں نے پوچھا کہ یہ بریلوی اور دیوبندی کون لوگ ہیں اور ان میں کیا فرق ہے۔ یورپ اور امریکہ کی مسجدوں میں ہر جگہ یہ جھگڑے پائے جاتے ہیں۔

لندن کی گرینڈ مسجد میں میں نے نماز پڑھی تو وہاں میں نے دیکھا کہ مسجد کے باہر طرح طرح کے ہینڈ بل تقسیم کئے جارہے ہیں۔ مثلاً ایک ہینڈ بل میں تھا کہ عمر بکری محمد کا محاضرہ (لکچر) فلاں مسجد میں

ہے۔ اس کا عنوان تھا : مآسی الامۃ الراھنۃ و الحل الاسلامی۔ فلسطین ، ماذا بعد الاستسلام۔ الوضع السیاسی فی الجزائر و الیمن و مستقبل الوحدۃ۔ ایک اور ہینڈ بل میں تھا کہ ابوطلحہ کا لکچر فلاں مسجد میں ہوگا۔ اس کا عنوان یہ بتایا گیا تھا : الشوریٰ والدیموقراطیۃ: ھل تتساویان ام تتناقضان۔ ایک اور ہینڈ بل میں شیخ ابو طارق کے محاضرہ کی خبر تھی۔ اس کا عنوان یہ تھا : الطریق الی الدولۃ الاسلامیۃ۔ ایک ہینڈ بل میں مؤتمر الخلافۃ اور اس کی سرگرمیوں کا تذکرہ تھا۔

یہاں "سنتوں کی سیوا" کے لئے جو عورت اور مرد کام کر رہے ہیں وہ سب اونچے گھرانوں کے لوگ ہیں۔ انھیں میں سے ایک خاتون ایک نوجوان کو لے کر میرے کمرہ میں آئی۔ اس نے کہا کہ یہ میرے منگیتر ہیں، آپ ہم دونوں کو آشیرواد دیجئے کہ ہمارا جیون سپھل رہے۔ میں نے نوجوان کے سر پر اپنا ہاتھ رکھ کر ان کے حق میں دعا کی۔ ہندستان کے سماج میں کسی عورت کا اس طرح کہنا بہت انوکھی بات ہے۔ لیکن مغربی سوسائٹی میں یہ بہت معمولی چیز ہے۔ نوجوان کو میں نے دیکھا تو وہ چہرے سے ایک شریف اور سنجیدہ آدمی نظر آیا۔

ایک روز صبح کو میں ہوٹل کے باہر ٹہل رہا تھا۔ ٹہلتے ہوئے میں ایک گوشے میں پہنچا۔ معلوم ہوا کہ یہ یہاں کا کوڑا خانہ ہے۔ مگر یہ کوڑا خانہ ویسا نہ تھا جو دہلی کی سڑکوں کے کنارے دکھائی دیتا ہے جہاں ایک کھلی ہوئی جگہ پر ہر قسم کا کوڑا ڈھیر کر دیا جاتا ہے۔ یہاں میں نے دیکھا کہ اس کوڑا خانہ کے اندر مخصوص قسم کی بند گاڑیاں ہیں جن میں پہیہ لگا ہوا ہے۔ یہ گاڑیاں بھی کریہہ المنظر نہیں تھیں بلکہ نیلے رنگ میں رنگی ہوئی خوبصورت گاڑیاں تھیں اور ان پر لکھا ہوا تھا : کلین اوے (Clean away) لوگ اپنا کوڑا ان بند گاڑیوں میں رکھ دیتے ہیں۔ پھر صفائی کے محکمہ کی گاڑیاں آکر ان کو اٹھالے جاتی ہیں۔

ایک سکھ پروفیسر جو اس جلسہ میں شرکت کے لئے انڈیا سے آئے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ یہاں سے مجھ کو امریکہ جانا ہے۔ وہاں کے کچھ سردار لوگوں نے ان کو بلایا تھا کہ آپ آکر ہمارے بچوں کو سمجھائیں کیوں کہ وہ بہت بگڑتے جا رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہی انڈیا سے آئے ہوئے تمام مذہبی فرقوں کا مسئلہ ہے۔ مگر سمجھانے بجھانے سے کچھ ہونے والا نہیں۔ آپ یہاں اپنا کلچرل جزیرہ بنا کر نہیں رہ سکتے۔ جو لوگ یہاں پیسہ کی خاطر آئے ہیں اس کی انھیں بہر حال یہ قیمت ادا کرنا ہے کہ ان کے لڑکے اور لڑکیاں ویسٹرن

طریقوں کو اختیار کریں۔ دوسری جنریشن تک ممکن ہے کہ کچھ کامیابی حاصل ہو جائے مگر تیسری جنریشن تک پہنچنے کے بعد تو کچھ بھی ہونے والا نہیں۔

۲ اگست کی شام کو "ورک شاپ" کے لئے اسلام کا موضوع رکھا گیا تھا۔ پہلے آدھ گھنٹہ تک میں نے اسلام کے تعارف پر ایک تقریر کی۔ اس کے بعد سوال و جواب ہوا۔ آج شرکا اجتماع کی تعداد سب سے زیادہ تھی، اور سوالات بھی بہت زیادہ ہوئے۔ سوامی چیدانند نے پہلے ہی مشورہ دیا تھا کہ مختصر جواب دیں۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو سوال کرنے کا موقع ملے۔ میں نے ایسا ہی کیا مگر سوال کرنے والے اتنے زیادہ تھے کہ سوالات کا سلسلہ ختم ہی نہیں ہو رہا تھا۔ اس پروگرام کے لئے مقرر وقت صرف ایک گھنٹہ کا تھا۔ مگر ڈیڑھ گھنٹہ تک جاری رکھنے کے بعد بھی سوالات ختم نہیں ہو رہے تھے۔ اس لئے منتظمین نے اعلان کیا کہ آج کا پروگرام اب ختم کیا جاتا ہے۔ البتہ لوگوں کے شوق کو دیکھتے ہوئے اسلام پر سوال و جواب کے لئے ایک اور نشست رکھی جائے گی۔ اس نشست کے بارہ میں لوگوں نے بہت زیادہ پسندیدگی کا اظہار کیا۔ ایک صاحب نے کہا کہ لندن کی تاریخ میں یہ شاید پہلا اجتماع ہوگا جس میں اتنے زیادہ مخالفانہ سوالات کو جواب دینے والے نے اتنے ٹھنڈے طریقہ سے اور کنونسنگ انداز میں جواب دیا ہو۔

جین دھرم کو ماننے والے ایک صاحب نے سوال کیا کہ آپ کہتے ہیں کہ اسلام رحمت اور امن کا مذہب ہے۔ پھر آپ لوگ جانوروں کو کیوں مارتے ہیں اور کیوں ان کو ذبح کرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں ذاتی طور پر ویجیٹیرین ہوں اور میں ایک پیدائشی ویجیٹیرین (born vegetarian) ہوں۔ اسلام میں بلاشبہ گوشت کھانا جائز ہے۔ مگر وہ کمپلسری نہیں ہے۔ اگر گوشت کھانا کمپلسری ہوتا تو میں بھی ضرور اسے کھاتا۔ کیوں کہ میں ایک پکا مسلمان ہوں۔

دوسری بات یہ ہے کہ آپ فطرت کے خلاف کوئی اصول نہیں بنا سکتے۔ " جیو ہتھیا" تو عین فطرت کے نظام میں شامل ہے۔ پانی اور سبزی اور ہوا میں بھی جیو ہیں۔ جب آپ ان کو استعمال کرتے ہیں تو آپ لاکھوں جیو کو مارتے ہیں۔ اگر آپ جیو ہتیا کے نظریہ کو مطلق مفہوم (absolute sense) میں لیں تو آپ کو یہ بھی کہنا پڑے گا کہ نہ پانی پیو، نہ سبزی کھاؤ، نہ دودھ استعمال کرو۔ کیا ایسا اصول اس دنیا میں چل سکتا ہے۔ پھر ہماری زمین میں ایسے خطے ہیں جہاں صرف گوشت ہی ملتا ہے، دوسری کوئی قابل

خوراک چیز وہاں نہیں ملتی۔ کیا آپ ان لوگوں سے کہیں گے کہ تم لوگ خودکشی کرلو۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ مطلق جیو ہتیا کی بات کرتے ہیں، انھیں اس سے پہلے ایک اور دنیا بنانا چاہئے جہاں نیچر کے قوانین موجودہ دنیا سے الگ ہوں۔ کیوں کہ موجودہ دنیا میں تو اس اصول پر عمل کرنا سرے سے ممکن ہی نہیں۔ حتی کہ خود اس نظریہ کو ماننے والے لوگ بھی ہر روز لاکھوں جانوں کا ذبیحہ کر رہے ہیں تبھی وہ زندہ ہیں۔ مزید یہ کہ پروٹین ہمارے برین کی نشوونما کے لئے بہت ضروری ہے۔ چنانچہ مشہور ہندستانی سائنٹسٹ ڈاکٹر سوامی ناتھن نے کہا ہے کہ ہمیں اپنی فوڈ ہیبیٹ کو بدلنا ہوگا، ورنہ ہم ذہنی بونا پن (intellectual dwarfism) کا شکار ہو جائیں گے۔

میرے اندر ایک عجیب کمزوری یہ ہے کہ میں کار سک (car sick) ہوں۔ یعنی کار میں سفر کرنے سے مجھ کو چکر آتا ہے۔ یہاں میرے لئے ایک عمدہ کار مخصوص کی گئی تھی۔ مگر اس میں سفر کرنے سے بھی مجھ کو چکر آگیا۔ مسٹر راجیش مجیٹھیا سے اس کا ذکر ہوا تو انھوں نے کہا کہ میں ابھی ڈاکٹر کو بلا کر لاتا ہوں۔ میں نے کہا کہ اس معاملہ میں کوئی دوا میرے لئے مفید نہیں۔ گھوڑا گاڑی یا ٹرین یا شپ یا ہوائی جہاز کسی بھی سواری میں مجھ کو ایسا نہیں ہوتا۔ مگر کار میں ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے، خواہ وہ کتنی ہی اچھی کار ہو۔ انھوں نے پوچھا کہ پھر ہم آپ کے لئے کیا کریں۔ میں نے کہا کہ اس کا علاج تو بس لیموں چوسنا ہے۔ مگر اس سے میرا گلا خراب ہو جاتا ہے۔

وہ فوراً بازار گئے اور ایک خوبصورت ڈبہ لے آئے۔ اس کے اندر پھلوں سے بنی ہوئی کھٹی میٹھی ٹافیاں تھیں۔ مگر ڈبہ کے اوپر اس کا نام کھٹی میٹھی ٹافی نہیں تھا۔ اس کے بجائے اس کے اوپر لکھا ہوا تھا: ٹریول سویٹ (Travel Sweet) یہ اہل مغرب کا خاص مزاج ہے۔ وہ ہر چیز کو ایک حسین آرٹ کی صورت دیدیتے ہیں۔ مثلاً ناشتہ کی میز پر سفید چینی کی پڑیہ کے ساتھ سوکھے گڑ کی پڑیہ بھی ہوتی ہے۔ مگر اس کا نام سوکھا گڑ نہیں ہوتا بلکہ براؤن شوگر (brown sugar) ہوتا ہے۔ اس ذوق نے خود ان کی زبان میں بھی ایک تہذیبی رنگ پیدا کر دیا ہے۔ مثلاً لندن میں چلتے ہوئے ایک ذیلی روڈ پر لکھا ہوا تھا ڈاگ لین (dog lane) انگریزی میں یہ لفظ برا معلوم نہیں ہوتا۔ حالاں کہ اسی کو اگر کتا گلی کہا جائے تو وہ سخت برا معلوم ہوگا۔

۲ اگست کی شام کی نشست (اسلام کا تعارف) کو لوگوں نے بہت پسند کیا۔ کثیر تعداد میں سوالات

کئے گئے۔ ایک ہندو سوال کرنے کے لئے کھڑے ہوئے تو پہلے انھوں نے دو بار السلام علیکم کہا۔ اس کے بعد اپنا سوال پیش کیا۔ جلسہ کے بعد جب میں منچ سے اٹھ کر جانے لگا تو جدھر جاتا ہر ایک السلام علیکم کہتا۔ عورت اور مرد سب ایسا ہی کر رہے تھے۔ یہ گویا ان کی طرف سے اپنی پسندیدگی کا اظہار تھا۔

کچھ انتہاپسند عرب نوجوان بھی جلسہ میں موجود تھے۔ ایک صاحب نے کہا کہ وہ قصداً یہاں آئے تھے اور انھوں نے گیٹ پر کچھ پمفلٹ بھی تقسیم کئے۔ ایک پمفلٹ کا عنوان تھا:

An invitation to think

اس میں یہ بتاتے ہوئے کہ اس دنیا کا ایک خدا ہے، یہ کہا گیا تھا کہ اس نے ایک مکمل نظام حیات ہم کو دیا ہے، یہ اسلام ہے۔ اسلام سرمایہ دارانہ نظام کا حقیقی بدل ہے جس کا آج ہم شکار ہو رہے ہیں:

Islam is the true alternative to the capitalist dominated world we are suffering from.

اسلام کو پیش کرنے کا یہی وہ طریقہ ہے جس نے اسلام کو لوگوں کی نظر میں ایک جنگجو مذہب بنا دیا ہے۔ خدا ہمارا خالق ہے، وہی ہمارا الٰہ ہے، یہ بات صدفی صد درست ہے۔ مگر اس کے بعد جو بات کہنے کی ہے وہ یہ کہ ہر آدمی اللہ کا پرستار بنے۔ وہ اپنے آپ کو اللہ کے رنگ میں رنگ لے۔ اس کے بجائے یہ لوگ عقیدۂ توحید کو بیان کرنے کے بعد فوراً یہ کہتے ہیں کہ خدا کے دین کو مکمل نظام کے طور پر زمین کے اوپر قائم کرنا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ موجودہ غیر خدائی نظام کو توڑا جائے تاکہ اس کی جگہ خدائی نظام کو نافذ کیا جاسکے۔ اس طرح سارا معاملہ "اسلام ورسس سسٹم" بن جاتا ہے، حالاں کہ اصل معاملہ "اسلام ورسس انڈیویجول" ہے۔

ان عرب نوجوانوں نے میری تقریر کے بعد کچھ تیز و تند سوال بھی کئے۔ مثلاً یہ کہ پیغمبر کا اصل کام بتوں کو توڑنا تھا، آپ نے کافروں سے لڑائیاں کیں۔ اور آپ یہاں کہہ رہے ہیں کہ اسلام امن اور سلامتی کا مذہب ہے۔ میں نے ہر سوال کا جواب ٹھنڈے طریقہ سے دیا۔ سوامی چیدانند نے بعد کو میرے طریقہ کی تائید کرتے ہوئے کہا: اشتعال کو ڈیفیوز کرنے کا آسان طریقہ صرف ایک ہے — نوری ایکشن (no re-action) سوامی چیدانند بڑی خصوصیات کے آدمی ہیں۔ جب بھی ان کی تعریف میں کچھ کہا جائے تو فوراً وہ کہیں گے: پربھو کی کرپا ہے۔

۳ اگست کی صبح کو ہوٹل سے جلسہ گاہ کے لئے روانگی ہوئی۔ مسٹر ہریش نگر یچا کار چلا رہے تھے۔ وہ یہاں تجارت کرتے ہیں۔ حسب عادت ان سے میں ان کے اپنے میدان کی باتیں کرتا رہا تاکہ ان سے کچھ نئی باتیں سیکھ سکوں۔ یہ صحابہ کا طریقہ ہے۔ چنانچہ حضرت عمر کے بارہ میں آتا ہے کہ وہ ہر ایک سے کچھ نہ کچھ سیکھتے تھے (کان یتعلّم من کل احد)

کار میں سیفٹی بیلٹ باندھتے ہوئے میں نے کئی باتیں اس کے بارہ میں دریافت کیں۔ انھوں نے بتایا کہ اب جرمنوں نے اس مقصد کے لئے ایک نئی چیز نکالی ہے۔ وہ وھیل کے ساتھ جڑی ہوتی ہے۔ اگر کار کو حادثہ پیش آجائے تو عین اسی وقت ایک بڑا سا غبارہ نکلتا ہے جو فوراً ہی ہوا سے بھر جاتا ہے۔ یہ کار اور مسافر کے درمیان فاصل (buffer) کی مانند حائل ہو جاتا ہے اور آدمی کو ٹکر سے بچالیتا ہے۔

مختلف راستوں سے گزرتی ہوئی ہماری گاڑی ایک مقام پر پہنچی۔ یہاں سڑک کے کنارے ایک سرسبز کمپاؤنڈ میں کچھ عمارتیں نظر آرہی تھیں۔ مسٹر نگر یچا نے بتایا کہ یہ گاربیج ریسرچ سنٹر ہے۔ یہ لوگ یہاں اس پر تحقیق کر رہے ہیں کہ کس طرح کوڑے جیسی بظاہر بیکار چیز کو ایک کارآمد چیز میں تبدیل کر سکیں۔

جلسہ گاہ میں داخل ہوئے تو وہاں عورت اور مرد گا رہے تھے: تو ہی بگاڑے تو ہی سنوارے، ہے رام، ہے رام۔ ہم لوگ عورتوں اور مردوں کے ہجوم سے گزر رہے تھے کہ آواز آئی "یہ سَنت نہیں، بھگوان کے سروپ ہیں"۔ جلسہ کی کارروائی شروع ہوئی تو ایک صاحب نے افتتاحی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ سَنت تو سنت ہیں۔ بدی سنتوں کو اگر نرک میں بھی جانا ہو تو وہاں بھی وہ رام کتھا ہی کریں گے۔ پھر انھوں نے یہ شعر پڑھا:

مرے سوا کوئی آئے نظر نہ دوزخ میں کسی کا ظلم ہو مالک مجھے سزا دینا

ایک اور صاحب نے تقریر کرتے ہوئے اپنا مشن یہ بتایا کہ ہم کو گھر گھر اور گلی گلی گیتا کا سندیش پہنچانا ہے:

گلی گلی اور گھر گھر میں جب سنسکرتی کریگی بسیرا ، وہ بھارت ہو گا میرا

اس قسم کی باتیں دیر تک مائک پر گونجتی رہیں۔ لوگ باربار تالیاں بجا کر اپنے جوش کا اظہار کرتے رہے۔ میں اپنی سیٹ پر غم زدہ حالت میں سوچ رہا تھا کہ حق بات لوگوں کو کس طرح بتائی جائے۔ دور قدیم میں جبر لوگوں کو چپ رکھتا تھا۔ دور جدید نے ہر ایک کو زبان دیدی ہے۔ ہر طرف بھانت بھانت کی آوازیں اس طرح بلند ہو رہی ہیں کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ ایسے شور وغل کے ماحول میں

کلمۂ حق کو قابل قبول بنانا تو درکنار اس کو لوگوں کے لئے قابل سماعت بنانا بھی عملاً ناممکن بن گیا ہے۔ آج داعیٔ حق اگر بولے تو اس کی بول اس عمومی ہنگامہ میں صرف شور میں ایک اضافہ بن کر رہ جاتی ہے۔

سنت شری بھائی اوزا نے کہا کہ میں کو مٹاتے جاؤ، مٹاتے جاؤ تو آخر میں کیول پرماتما ہی بچے گا۔ انھوں نے کہا کہ امریکہ میں میں گیتا پر بول رہا تھا کہ ایک ہندو نوجوان نے کھڑے ہو کر سوال کیا کہ گیتا کے شری کرشن بار بار میں کی زبان بولتے ہیں، آخر وہ اتنے خود پسند (egoist) کیوں ہیں۔

تقریروں کے بعد مراری باپو (باپوجی) کی کتھا شروع ہوئی۔ وہ مختلف قسم کے کلمات دہراتے تھے اور مجمع بھی تالیاں بجا کر انھیں دہراتا تھا۔ مثلاً کرپا کرو گرو دیو کی نائی۔ وہ رامائن سے لے کر ہنومان جی کے قصہ کی تشریح کرتے ہیں۔ اس کا انھیں خاص ملکہ حاصل ہے۔ انھوں نے کہا کہ سنت لوگ کتھا کرتے ہیں اپنی مستی کے لئے، دوسروں کو سنانے کے لئے نہیں۔ انھوں نے کہا کہ باغ میں پھول کو ہر آدمی اپنے اپنے ڈھنگ سے دیکھتا ہے۔ پر بھگت پھول کو دیکھ کر کہہ اٹھتا ہے کہ پھول اتنا سندر ہے تو میرا کرشن کتنا سندر ہوگا۔ میں نے کہا کہ موحد اسی کو اس طرح کہے گا کہ خدا کتنا سندر ہوگا۔

مراری باپو کا اور میرا اس سے پہلے بمبئی میں آدھ گھنٹہ کے لئے کسی میٹنگ میں ساتھ ہوا تھا۔ مجھے یہ بات یاد نہ تھی۔ مراری باپو نے اس کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اس کے بعد بمبئی کے مرہٹی اخبار میں چھپا کہ مراری باپو مولانا صاحب کے ساتھ حج کے لئے جارہے ہیں۔ دوسری طرف میرے بارہ میں وہاں کے اردو اخبار میں چھپا کہ مولانا صاحب مراری باپو کے ساتھ گنگا اشنان کے لئے جانے والے ہیں۔ اخباروں کی اسی الٹی خبر رسانی نے موجودہ زمانہ میں سارا معاملہ بگاڑ رکھا ہے۔

اہل مغرب کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ انھوں نے انسانیت کو بے عقلی کے دور سے نکال کر عقل کے دور میں پہنچایا ہے۔ مگر یہ ایک فریب کے سوا اور کچھ نہیں۔ ایک صاحب نے بتایا کہ ایک مغربی مفکر کی یہاں تقریر ہوئی۔ اس نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا کہ ساری علمی ترقیوں کے باوجود آج بھی کائناتی سوالات کا کوئی عقلی جواب ہمارے پاس نہیں ہے۔ اس نے بتایا کہ ایک بڑے سائنٹسٹ سے پوچھا گیا کہ درخت ہرے کیوں ہیں (Why the trees are green) وہ کہہ سکتا تھا کہ کلوروفل کی وجہ سے۔ مگر پھر سوال ہوگا کہ کلوروفل میں یہ صفت کیسے ہے، اور اس قسم کے ہزاروں سوالات جن کا کوئی جواب سائنس داں کے پاس نہیں۔ چنانچہ اس نے کہا کہ درخت ہرے

ہیں اس لئے کہ وہ ہرے ہیں :

Trees are green because they are green.

۳ اگست کی شام کو مسٹر رجنی کانت مہتا ملاقات کے لئے آئے۔ وہ لندن میں رہتے ہیں اور بمبئی کے ایک گجراتی اخبار (بمبئی سماچار) میں "ٹیمز کے ساحل سے" کے زیر عنوان کالم لکھتے رہتے ہیں۔ انھوں نے اپنے اخبار کے لئے انٹرویو لیا۔ ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ تخریب کاری کبھی لامحدود طور پر جاری نہیں رہ سکتی۔ تخریب کاری کی ایک حد ہوتی ہے اور اپنی حد پر پہنچ کر ہمیشہ تخریب کاری ختم ہو جاتی ہے۔ اس دنیا میں تعمیر ابدی ہے اور تخریب صرف وقتی۔

شری مراری باپو نے اپنی ایک کتھا میں کہا کہ ہم لندن میں گھومنے کے لئے نہیں آئے بلکہ تمہارا دماغ گھمانے کے لئے آئے ہیں۔ تمہارا چنتن بدل جائے اس کے لئے آئے ہیں۔ یہاں بسے ہوئے ہندستانی جو اس طرح کی مجلسوں کا انتظام کرتے ہیں اس کا زیادہ بڑا محرک یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنی نئی نسل کو اپنے آبائی مذہب پر باقی رکھ سکیں۔ مگر ان کوششوں کا انجام کیا ہے، اس کو خود مراری باپو نے ایک واقعہ کی صورت میں بیان کیا۔

انھوں نے کہا کہ بھارت سے ایک مہاتما یہاں آئے۔ یہاں روزانہ ان کا بیان ہوتا تھا۔ ایک ہندو نے ان سے مل کر کہا کہ میرا ایک بیٹا ہے۔ اس کو بہت کہتا ہوں کہ وہ آپ کی مجلسوں میں آئے۔ مگر وہ آتا نہیں۔ کرپا کر کے آپ میرے یہاں چلیں اور میرے بیٹے کو آشیرواد دیں۔ مہاتماجی سرل آدمی تھے، مان گئے۔ فرصت ملنے کے بعد وہ اس ہندو کے گھر گئے۔ اس وقت رات کے ۱۲ بجے تھے اور لڑکا اپنے کمرہ میں سوچکا تھا۔ ماں باپ بڑی شردھا سے مہاتماجی کو لڑکے کے کمرہ میں لے گئے۔ اس کو اٹھایا اور کہا کہ دیکھو یہ مہاتماجی آئے ہیں، اٹھو اور ان کا آشیرواد لو۔ لڑکا اٹھا اور مہاتماجی کے سر پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ یہ قصہ بتا کر مراری باپو نے کہا : اس نوجوان کو یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ مہاتما کے سر پر ہاتھ نہیں رکھا جاتا بلکہ جھک کر ان کے چرنوں کو چھوا جاتا ہے۔

اس معاملہ میں ٹھیک یہی کہانی مسلمانوں کی بھی ہے۔ مگر اس قسم کا تہذیبی جزیرہ (cultural island) بنانا کسی کے لئے بھی ممکن نہیں۔ مزید یہ کہ یہاں ایک تضاد بھی پایا جاتا ہے۔ ہندستان کے ہندوؤں کو یہ پسند نہیں کہ وہاں کے مسلمان ہندستان میں اپنا الگ تہذیبی تشخص قائم کریں۔ اسی

طرح پاکستان کے ہندو اگر پاکستان میں اپنا علیحدہ تشخص قائم کرنے کی کوشش کریں تو وہاں کے مسلمان اس کو گوارا کرنے کے لئے تیار نہیں۔ مگر یہی ہندو اور مسلمان جب باہر کے ملکوں میں جاتے ہیں تو وہاں ان کی سب سے بڑی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ یہاں اپنے علیحدہ تشخص کو باقی رکھ سکیں اس تضاد کے ساتھ کسی کام میں کامیابی حاصل کرنا ممکن نہیں۔

ورک شاپ میں ایک ہندو نے یہ سوال کیا کہ کیا گرو کو بھگوان کہا جا سکتا ہے۔ اس کا جواب یہ دیا گیا کہ گرو کو خود نہیں بولنا چاہئے کہ میں بھگوان ہوں۔ مگر شِشیوں کو یہی سمجھنا چاہئے کہ گرو جو ہے وہی بھگوان ہے، بلکہ گرو بھگوان سے بھی بڑھ کر ہے۔ کیوں کہ گرو کے بغیر بھگوان کو پانا ممکن نہیں اس پر بعد کو شری رام باپا نے مجھ سے سوال کیا کہ کیا منش بھگوان ہو سکتا ہے۔ بھگوان والی یاوا کیا منش میں آسکتی ہے۔ میں نے کہا کہ اسلام میں ایسا نہیں مانا گیا ہے۔ اسلام میں خدا خدا ہے، اور انسان انسان۔ مزید یہ کہ اسلام کے مطابق، خدا کو پانے کے لئے کسی درمیانی واسطہ کی ضرورت نہیں۔

۳ اگست کی شام کو حسب معمول ورک شاپ تھی۔ یہ ایک مشترک ورک شاپ تھی جس میں پانچ "سَنت" سوالات کا جواب دینے کے لئے بٹھائے گئے تھے۔ ان میں سے ایک میں بھی تھا۔ اسلام کے بارہ میں جو سوالات آئے ان کا جواب میں نے دیا۔ مگر یہ سوالات زیادہ تر غلط فہمی کی نوعیت کے تھے۔ مثلاً ایک صاحب نے کہا کہ مکہ کے کعبہ میں جب شیو لنگ موجود ہے تو ہندوؤں اور مسلمانوں میں یہ اختلافات کیوں پائے جاتے ہیں۔ ایک صاحب نے کہا کہ ہم نے سنا ہے کہ قرآن میں لکھا ہوا ہے کہ گائے کی پوجا کرو۔ میں نے کہا کہ یہ سب بالکل بے بنیاد باتیں ہیں۔ ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ ایک سوال عید الاضحیٰ کے تیوہار کے بارہ میں تھا، اس کی میں نے وضاحت کی اور بتایا کہ عید الاضحیٰ کا مقصد کیا ہے۔

یہ ورک شاپ ہوٹل کے وسیع لان میں رکھی گئی تھی۔ ہم لوگ وہاں پہنچے تو چھوٹے بچے مل کر گیت گارہے تھے۔ اس کا ایک شعر یہ تھا:

ہند دیش کے نواسی سبھی جان ایک ہے رنگ روپ ویش بھاشا چاہے انیک ہے

ہندو دھرم سے متعلق سوال کا جواب دینے کے لئے کئی لوگ موجود تھے ـــــ شری رمیش بھائی اوزا، سوامی چیدانند، ڈاکٹر ایل ایم سنگھوی، ڈاکٹر کے ایل سیشا گری راؤ۔

لندن میں مقیم ایک ہندو نے سوال کیا کہ کیا وجہ ہے کہ ہندو لوگ ہندو دھرم کو چھوڑ کر مسلمان یا عیسائی بن جاتے ہیں۔ کیا ہمارے دھرم میں کوئی خرابی ہے۔ ایک سوال یہ تھا کہ ہندو دھرم میں اتنے زیادہ خدا کیوں ہیں، جب کہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سچائی صرف ایک ہے۔ ایک سوال یہ تھا کہ کہا جاتا ہے کہ گرو کا درجہ بھگوان سے بھی زیادہ ہے، ایسا کیوں۔ ایک تعلیم یافتہ ہندو نے سوال کیا کہ ہندوازم کی تعریف کیا ہے۔ ڈاکٹر سیشاگری راؤ (اڈیٹر انسائیکلو پیڈیا آف ہندوازم) نے مہاتما گاندھی کی زبان میں جواب دیا کہ ہندوازم پرامن طور پر سچائی کی تلاش ہے:

Hinduism is a search for truth through non-violent means.

شری رمیش بھائی اوزا نے ایک سوال کے جواب میں جو بات کہی وہ شاید ان مذاہب سے متعلق تمام سوالات پر چسپاں ہوتی ہے۔ ایک ہندو نوجوان نے سوال کیا کہ مہابھارت کے اندر بھگوان کرشن دھوکا دیتے ہیں۔ اور دوسری غیر اخلاقی باتیں کرتے ہیں۔ پھر وہ کیسے بھگوان ہیں۔ شری رمیش بھائی اوزا نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ عقل سے اس کا جواب دینا بہت مشکل ہے۔ ایک شخص نے شری کرشن کی طرف سے کہا ہے، اسی کو یہاں میں دہراؤں گا ــــ مجھ کو سمجھنے کی کوشش نہ کرو، بس مجھ سے پریم کرو:

Don't try to understand me. Just love me.

۴ اگست کی صبح کو حسب معمول ہوٹل سے جلسہ گاہ (راونڈووڈ پارک) کے لئے روانہ ہوا۔ ہماری کار میں دو پروفیسر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک ڈاکٹر شیشا گری راؤ اور دوسرے صاحب جو کار کو چلا رہے تھے۔ صاحب کار نے کہا کہ آجکل میں ایک مغربی مصنف کی کتاب پڑھ رہا ہوں۔ اس کا نام ہے مسرت کا شہر (City of Joy)۔ انڈیا کے تذکرہ کے تحت اس میں بتایا گیا ہے کہ دیوالی ہندوؤں کے لئے جوئے کا تیوہار ہے۔ دیوالی میں ہندو بڑے پیمانہ پر گیمبلنگ کرتے ہیں۔ یہ بات انھوں نے تنقیدی انداز میں کہی۔ اس کا دفاع کرتے ہوئے ڈاکٹر راؤ نے کہا کہ گیمبلنگ تو زندگی کا حصہ ہے۔ آپ کی میرج بھی تو گیمبلنگ ہے۔ میں نے کہا کہ میرج گیمبلنگ نہیں ہے، البتہ وہ رسک ہے، اور رسک بلاشبہ زندگی کا ایک حصہ ہے۔ صاحب کار نے میری بات سے اتفاق کیا۔ ڈاکٹر راؤ جو زیر ترتیب انسائیکلو پیڈیا آف ہندوازم کے چیف اڈیٹر ہیں، انھوں نے کہا کہ ہندوازم اتنا پیچیدہ ہے

کہ کوئی بھی بات جو آپ ہندو ازم کی طرف منسوب کریں اس کی فوراً کوئی تردید کی جاسکتی ہے:

Hinduism is so complex that you cannot claim anything which cannot immediately be denied.

روایتی طریقہ کے مطابق آج بھی کارروائی شروع ہوئی۔ پہلے تین صاحبان نے تقریر کی: پنڈت وتیج رنگایا (بدھسٹ) سرسگمنڈ اسٹمبرگ (یہودی) ریورنڈ مارکس (عیسائی)۔ تینوں تقریروں کے بعد بھارتیہ ودیا بھون کے چیرمین کھڑے ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ تینوں مقررین نے جو بات کہی عین وہی ہندو اسکرپچر میں بھی ہے۔ دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں:

There is absolutely no difference.

اس کے بعد حسب معمول مراری باپو کی کتھا شروع ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ وہ رامائن کے قصیدوں کی خوبصورت توجیہ میں خاص مہارت رکھتے ہیں۔ اس کی مثالیں ان کے ہر بیان میں کثرت سے ملتی ہیں۔ مثلاً رامائن کے مطابق، سیتا کو راون چرا کر لنکا لے گیا۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ بھلا سیتا کو کوئی چرا سکتا ہے۔ سیتا چرائی نہیں گئیں۔ وہ رام کی رضامندی سے لنکا کو پوتر کرنے کے لئے ماں کے روپ میں لنکا گئی تھیں۔ انھوں نے لنکا کو پاتر تا دیا۔ اسی طرح رام چرت مانس میں ہے کہ ہنومان جی لنکا گئے تو انھوں نے دیکھا کہ وہاں ہر مکان مندر ہے۔ انھوں نے اس کی توجیہ یہ کی کہ ہنومان جس گھر میں جائیں وہ تو مندر ہی ہو جائے گا۔ اگرچہ یہ طے کرنا مشکل ہے کہ ان کی یہ توجیہات فی الواقع توجیہ ہیں یا لطیفہ۔

درمیان میں وہ طرح طرح کے نکتے بیان کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً ایک قصہ کے ذیل میں انھوں نے کہا: نہ بھوگنا ہے، اور نہ بھاگنا ہے، کیول پربھو (کرشن) میں بھیگنا ہے۔ ایک قصہ کے ضمن میں انھوں نے کہا کہ ایک سجن نے مجھ سے پوچھا کہ باپو، آپ سورگ میں جائیں گے یا نرک میں۔ میں نے کہا کہ نہ ہم کو سورگ میں جانا ہے اور نہ ہم کو نرک میں جانا ہے۔ ہم کو بار بار سنسار (بھارت) میں جنم لینا ہے اور یہی رام کتھا کرنا ہے۔ اگر بھگوان نے ہم کو نرک میں ڈال دیا تو ہم بھگوان سے کہیں گے کہ ہم کو دو ستاکر دو کہ ہم یہاں بھی اپنی رام کتھا کرتے رہیں۔ رام کتھا وہ نہایت جوش اور مستی کے ساتھ کرتے ہیں۔ آج وہ چار گھنٹہ تک مسلسل کتھا کرتے رہے۔ مگر نہ وہ تھکے اور نہ ۲۵ ہزار کا مجمع اکتایا۔

گھنٹوں تک جاری رہنے والی پوری کتھا قصے کہانیوں سے بھری ہوئی ہے۔ مثلاً انھوں نے بتایا کہ بال شنکر کی ماں کو کسی سخت ضرورت سے باہر جانا تھا اور اگلے دن درگا پوجا کا دن آنے والا تھا ماں نے اپنے بچہ سے کہا کہ مجھ کو جانا ضروری ہے۔ تم ایسا کرنا کہ درگا پوجا کے دن ایک پیالہ میں گائے کا تازہ دودھ لے کر درگا دیوی کو بھوگ لگا دینا۔ بال شنکر نے ماں کے کہنے کے مطابق، اگلے دن ایک صاف پیالہ میں دودھ بھرا اور گھر میں درگا دیوی کی جو مورتی تھی اس کے سامنے اسے رکھ دیا۔ اس کے بعد بال شنکر ہاتھ جوڑ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ بچہ یہ سمجھتا تھا کہ ماں درگا پیالہ کا دودھ پئے گی۔ لیکن ایک گھنٹہ، دو گھنٹہ گزرا۔ کئی گھنٹے گزر گئے مگر دودھ ویسا کا ویسا پڑا رہا۔ اب بال شنکر رو پڑا۔ اس نے کہا کہ ماں، تم دودھ کیوں نہیں پیتی ہو۔ کیا اس لئے کہ میں چھوٹا بالک ہوں۔ وہ روتا رہا۔ یہاں تک کہ درگا دیوی نے پیالہ کا سارا دودھ پی لیا۔ یہ دیکھ کر بال شنکر دوبارہ رونے لگا۔ اس نے کہا کہ میری ماں تو پیالہ کا آدھا دودھ پیتی تھی اور آدھا میرے لئے چھوڑ دیتی تھی اور تم سارا ہی دودھ پی گئیں۔ جب اس نے ایسا کہا تو درگا دیوی نے بچہ کو اپنی گود میں اٹھالیا اور اپنی چھاتی سے اس کو دودھ پلایا۔

یہ عجیب وغریب قصہ انھوں نے یہ ثابت کرنے کے لئے سنایا کہ انسان اگر بھگوان سے سچے دل سے مانگے تو وہ ضرور اس کو دیتا ہے۔ چنانچہ ماں جب بھوگ لگاتی تھی تو درگا دیوی نے کبھی اس کو نہیں پیا۔ مگر جب بال شنکر رو پڑا تو اس نے دودھ کو نہ صرف پیا بلکہ خود بچہ کو بھی پلایا۔

اس قسم کی انوکھی کہانیوں اور توجیہات سے ان کی کتھا بھری ہوئی ہے۔ عین یہی بات خود مسلمانوں میں بھی پوری طرح داخل ہو چکی ہے۔ مسلمانوں کے یہاں لاکھوں بے اصل کہانیاں پھیلی ہوئی ہیں اور بزرگوں کے بیانات زیادہ تر انھیں سے بھرے ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آج دونوں ہی فرقے قصہ کہانیوں کی ایک طلسم ہوش ربا میں گم ہیں۔ ان میں سے کسی کو بھی خدا کی اصل ہدایت کا پتہ نہیں۔

۴ اگست کی شام کی ورک شاپ صرف سوال وجواب کے لئے تھی۔ اس میں چار لوگوں کو سوالات کا جواب دینا تھا ـــــ چیف جتھے دار پروفیسر منجیت سنگھ، سنت شری رمیش بھائی اوزا، شریمتی جیجاجی، اور راقم الحروف۔

شریمتی جیجاجی نے ایک سوال کے جواب کے تحت کہا کہ ہندو کا لفظ ہمارے شاستروں میں نہیں

ہے۔ اس لئے ہم کو اس لفظ کا استعمال چھوڑ دینا چاہئے۔ اس کے بجائے ہم کو بھارتیہ (بھارتی) کا لفظ استعمال کرنا چاہئے۔ یہ زیادہ صحیح لفظ ہے اور ہندستان میں کسی کو بھی اس لفظ کے استعمال پر اختلاف نہیں ہوگا۔ ایک سوال یہ تھا کہ جب پوجا صرف بھگوان کی ہے تو گرو کے سامنے پوجا کیوں۔ شریمتی جیجا جی نے اس کے جواب میں کہا کہ گرو ہم کو بھگوان سے ملاتا ہے اس لئے اس کا اعتراف تو کرنا ضروری ہے۔ ہمیں گیان دینے والے کا سمان کرنا ہے۔ پھر اس کو کیسے کریں۔ ہماری پرمپرا میں "تھینک یو" نہیں ہے۔ بلکہ پوجا ہے۔ جس اعتراف کے لئے یورپ کے لوگ تھینک یو کہتے ہیں، اس کے لئے ہمارے یہاں پوجا کا طریقہ ہے۔

اسلام کے بارہ میں کئی سوالات کئے گئے جن کا میں نے جواب دیا۔ ایک سوال یہ تھا کہ اسلام اتنا زیادہ بے برداشت (intolerant) مذہب کیوں ہے۔ میں نے کہا کہ اگر آپ یہ کہیں کہ آجکل کے کچھ مسلمان بے برداشت ہوگئے ہیں تو میں صد فی صد اس سے اتفاق کروں گا۔ لیکن اگر آپ یہ کہیں کہ اسلام بے برداشت مذہب ہے تو میں اس سے صد فی صد اختلاف کروں گا۔ ڈاکٹر سیشا گری راؤ نے بتایا کہ انھیں یہ جواب بہت پسند آیا۔ ایک ہندو نوجوان نے عین جلسہ کے درمیان کھڑے ہو کر کہا: آج سے پہلے میں مسلم سے ہیٹ کرتا تھا، آج میری ہیٹ ختم ہوگئی۔ اسی قسم کی بات کئی اور ہندو نوجوانوں نے مجھ سے کہی بہت سے ہندو میرے کمرہ میں آئے اور اس بات کا اعتراف کیا کہ میری باتیں سن کر اسلام کے بارہ میں ان کی غلط فہمی دور ہوگئی۔

جلسہ کے بعد بہت سے ہندو، خاص طور پر نوجوان، مجھ سے ملے اور کہا کہ ہمارے دل میں اسلام کے خلاف بہت سی باتیں بھری ہوئی تھیں۔ ہم اسلام کو ایک برا مذہب سمجھتے تھے۔ مگر آپ کی باتیں سننے کے بعد ہمارا ذہن صاف ہوگیا اور اسلام کے خلاف ہمارے جو خیالات تھے وہ ختم ہوگئے۔ کئی ہندو ایسا کہتے ہوئے رو پڑے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے کتنی گہرائی کے ساتھ باتوں کا اثر قبول کیا تھا۔

کئی انگریز نومسلموں سے ملاقات ہوئی۔ ان میں سے ایک عبد العظیم صاحب (عمر ۴۸ سال) تھے۔ ان کا قدیم نام پیٹر سینڈرس (Peter Sanders) ہے۔ انھوں نے ۱۹۷۰ میں اسلام قبول کیا۔ وہ اپنی دس سال کی بچی فردوس کے ساتھ آئے۔ بچی نے بتایا کہ وہ جس اسکول میں پڑھتی

ہے اس میں کچھ پاکستانی بچے بھی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ تم آدھی مسلم (half-Muslim) ہو۔ کیوں کہ تمہاری پیدائش انگلینڈ میں ہوئی۔ پاکستان میں پیدا ہونے والے لوگ پورے مسلمان ہیں۔

۴ اگست کی دوپہر کو جب لندن کے راونڈ وڈ پارک میں مراری باپو کی کتھا ہو رہی تھی، ایک عجیب قصہ پیش آیا۔ کتھا کے درمیان جوش میں آکر ایک ہندو خاتون کھڑی ہو گئی۔ اس کے ہاتھ میں ترنگا ہندستانی جھنڈا تھا۔ وہ اس جھنڈے کو اٹھا کر فضا میں لہرانے لگی۔ یہ دیکھ کر باپو جی نے کہا: جھنڈا اونچا رہے ہمارا۔ اور پھر حاضرین تالیاں بجا کر ہندستان کا قومی ترانہ جن من گن بلند آواز سے گانے لگے۔ وسیع شامیانہ میں کچھ دیر کے لئے یہ منظر تھا کہ فضا میں ہندستانی جھنڈا لہرا رہا ہے۔ اور دوسری طرف وسیع پنڈال میں جن من گن کا ترانہ گونج رہا ہے۔

اس وقت اسٹیج پر دو انگریز بیٹھے ہوئے تھے۔ اسی کے ساتھ پھیلی ہوئی جلسہ گاہ میں کئی انگریز نوجوان تھے جو ویڈیو ریکارڈنگ کے نظام کی نگرانی کر رہے تھے۔ ممکن ہے کہ حاضرین میں بھی کچھ انگریز موجود ہوں۔ لیکن انگریز یہ منظر دیکھ کر صرف مسکراتے رہے۔ کسی نے بھی ناراضگی یا احتجاج کا کوئی مظاہرہ نہیں کیا۔ حالاں کہ اگر ہندستان یا پاکستان کے کسی جلسہ میں اس نوعیت کا واقعہ ہو تو اسی وقت ہنگامہ کھڑا ہو جائے گا۔ اور عجب نہیں کہ وہ خونیں فساد کے مرحلہ تک پہنچ جائے ——— قوموں کی ترقی کا راز صبر ہے اور قوموں کی ناکامی کا راز بے صبری۔

ڈاکٹر سیتشا گری راؤ سے میں نے پوچھا کہ انگریزوں اور ہندستانیوں میں مزاج کے اعتبار سے کیا فرق ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہندستانی لوگ ایموشنل (جذباتی) ہوتے ہیں اور انگریز حقیقت پسند۔ میں نے کہا کہ اسی فرق نے دونوں کے درمیان وہ فرق پیدا کر رکھا ہے جو موجودہ زمانہ میں پایا جاتا ہے ۔ انگریزوں نے ایک عالمی ایمپائر بنایا۔ مگر اتنے بڑے ایمپائر میں کسی بھی مقام پر کسی انگریز نے روولٹ (revolt) نہیں کیا۔ دوسری طرف اورنگ زیب نے ملکی سطح پر ایک چھوٹا سا امپائر بنایا اور اس کا حال یہ ہوا کہ ہر حاکم اور گورنر جس کو موقع ملا وہ مرکز سے بغاوت کر کے اپنی الگ سلطنت بنا کر بیٹھ گیا۔ آج آزاد ہندستان میں ہر سرحدی ریاست میں سیاسی لیڈر یہ تحریک چلا رہے ہیں کہ کس طرح وہ اس کو نئی دہلی سے کاٹ لیں اور وہاں اپنی ایک الگ ریاست قائم کر دیں۔

مراری باپو اکثر کتھا کے آخر میں کہتے تھے : بھگوان سے ایک ہی چیز مانگو۔ تمہاری ملاقات

کسی سچے سادھو سے کرا دے جو تمہارے اندر کو خالی کر کے اس کو گیان سے بھر دے۔ ہندو دھرم میں گرو کو مرکزی مقام حاصل ہے۔ عجیب بات ہے کہ عین یہی تصور اب مسلمانوں میں بھی پوری طرح آ گیا ہے۔ مسلمانوں نے بھی کچھ "بڑے" فرض کر لئے ہیں۔ ان کا سارا مذہب انہیں انسانی بڑوں کے گرد گھومتا ہے۔ خدا مرکزی مذہب نہ ہندوؤں کے یہاں پایا جاتا ہے اور نہ موجودہ مسلمانوں کے یہاں۔

مراری باپو کی کتھا خوبصورت انداز میں ہندوازم کا پرچار ہوتی ہے۔ اس کی ایک مثال لیجئے۔ ۴ اگست کی کتھا کے دوران انھوں نے کہا کہ آجکل کے بچے بہت ہوشیار ہیں۔ ایک باپ نے اپنے چھوٹے بچہ کو بتایا کہ کوئی چیز ناممکن نہیں۔ نپولین نے کہا ہے کہ ناممکن کا لفظ صرف بیوقوفوں کی ڈکشنری میں پایا جاتا ہے۔ بیٹا یہ سن کر باتھ روم میں گیا۔ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ٹوتھ پیسٹ کا ٹیوب تھا۔ اس نے ٹیوب دبا کر پیسٹ نکالا اور پھر باپ سے کہا کہ اگر ہر چیز ممکن ہے تو آپ اس پیسٹ کو دوبارہ ٹیوب میں ڈال دو۔ باپ نے ہار مان لی۔

انھوں نے بتایا کہ مجھ سے یہاں کے ایک بچہ نے کہا کہ باپو یہ بتائیے کہ بی (B) ٹھنڈا کیوں ہوتا ہے۔ مراری باپو نے بہت سوچا مگر بی کے ٹھنڈا ہونے کی بات سمجھ میں نہ آئی۔ بچہ نے مسکراتے ہوئے ان سے کہا کہ بی اس لئے ٹھنڈا ہوتا ہے کہ وہ اے اور سی کے درمیان ہوتا ہے:

Because it is between A/C.

مراری باپو نے اس قصہ کو بتانے کے بعد کہا کہ آجکل کے بچے جو اتنے زیادہ ہوشیار ہو گئے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے بار بار جنم لیا۔ بار بار وہ اس دنیا میں آ کر اپنا گیان بڑھاتے رہے۔ مراری باپو نے اس طرح مذکورہ قصہ سے ہندوازم کا آواگمن کا نظریہ ثابت کیا۔ مگر انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ خود مراری باپو نے کیا بار بار جنم نہیں لیا ہے۔ بار بار جنم لینے والی ہوشیاری صرف برطانیہ کے لوگوں میں کیوں آئی ہے، جب کہ وہ اس عقیدہ کو مانتے ہی نہیں۔

ایک تعلیم یافتہ ہندو اپنی اہلیہ کے ساتھ آئے۔ انھوں نے کہا کہ ہم آپ کا آشیرواد لینے کے لئے آئے ہیں۔ خاتون نے بتایا کہ ان کے گرو دہرہ دون کے پاس رہتے ہیں۔ انھوں نے برسوں تک جھاڑی میں رہ کر تپسیا کی ہے۔ اب ۱۲ برس سے وہ مون میں ہیں۔ بہت پہنچے ہوئے فقیر ہیں۔ ہندو قوم میں دا اور شاید

انھیں کے اثر سے مسلمانوں میں بھی) "فقیر" کا لفظ اپنے اندر ایک طلسماتی اثر رکھتا ہے۔ میں چوں کہ بہت سادہ رہتا ہوں۔ میرے دبلے پتلے جسم اور میرے الجھے ہوئے بال میں انھیں فقیر کی تصویر دکھائی دیتی ہے۔ چنانچہ وہ لوگ مجھ کو دیکھ کر بہت زیادہ تاثر کا اظہار کرتے ہیں۔

صوفیوں کی طرف ہندوؤں کا کھنچاؤ اسی لئے ہوا کہ صوفی کی ترک دنیا کی زندگی میں ہندو کو فقیری کا رنگ دکھائی دیا۔ اسی قسم کے ایک صوفی سے احمد آباد کے قریب بہت سے ہندو متاثر ہوئے۔ یہ لوگ اس وقت تقریباً ۱ لاکھ کی تعداد میں ہیں۔ مگر وہ آدھے ہندو آدھے مسلمان بن کر رہ گئے۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ صوفی کے یہاں صرف شخصیت کا وسیلہ کام کر رہا تھا۔ شخصیت کے مٹنے کے بعد کوئی اور چیز (مثلاً لٹریچر) موجود نہ تھا جو ان متاثرین کی مزید ترقی کا ذریعہ بن سکے۔ خبر ہے کہ اب وہ لوگ دوبارہ اپنے قدیم مذہب کی طرف لوٹا دئے گئے ہیں۔

لندن میں مختلف اجتماعات میں میری کئی تقریریں ہوئیں۔ اسلام کے بارہ میں سوالات کا جواب دینے کا موقع ملا۔ اس کے بعد ہندو مجھ سے اس طرح ملنے لگے جیسے کہ میں ان کا روحانی گرو ہوں۔ کثرت سے ہندو مرد اور عورت میرے پاس آتے اور اپنے غیر معمولی تاثر کا اظہار کرتے۔ ان میں سے اکثر کو میں نے دیکھا کہ وہ اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے رونے لگے۔ حتی کہ کئی ہندوؤں نے کہا کہ رام کتھا سے زیادہ ہم کو آپ کے ذریعہ ملا ہے۔

میں دنیا کے اکثر ملکوں میں گیا ہوں۔ ہر قوم کے لوگوں سے میرا سابقہ پیش آیا ہے۔ ایشیا افریقہ، یورپ، امریکہ، غرض ہر جگہ کے لوگوں کے بارہ میں مجھے براہ راست طور پر جاننے کا موقع ملا ہے۔ مگر یہ بات میں نے صرف ہندوؤں میں پائی۔ ہر قوم میں مجھے ایسے لوگ ملے جنھوں نے میری تحریر یا تقریر پر غیر معمولی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ مگر دوسری کسی بھی قوم میں مجھ کو ایسے لوگ نہیں ملے جو اپنے تاثرات کو ظاہر کرتے ہوئے رونے لگیں۔ یہ تاثر پذیری (receptivity) کم از کم میرے تجربہ میں، صرف ہندوؤں میں پائی جاتی ہے۔ ان کی اس صفت کو سوچ کر میں بے اختیار رونے لگتا ہوں اور دل کی گہرائیوں سے یہ دعا نکلتی ہے کہ خدایا، تو اس قوم کی ہدایت کا سامان کر۔ خدایا، تو اس قوم کے لئے اپنی معرفت کے دروازے کھول دے۔ خدایا، تو اس قوم کو اپنے دین کے لئے قبول فرما۔

۵ اگست کو صبح نو بجے کا وقت ہے۔ دروازہ کھولتا ہوں تو ایک ہندو نوجوان کھڑے ہوئے ملتے

ہیں۔ وہ لسٹر میں میڈیکل کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ انھوں نے اپنا نام اچاری بتایا۔ انھوں نے ہندو طریقہ سے مجھے "پرنام" کیا۔ اور پھر کہا: ہم لوگوں کو بہت غلط امپریشن تھی اسلام کی۔ اب آپ کو سننے اور دیکھنے کے بعد ہماری ساری درشٹی بدل گئی۔

اس طرح کی بات یہاں بہت سے ہندوؤں نے کہی۔ خاص طور پر نوجوان طبقہ نے غیر معمولی تاثر کا اظہار کیا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ ہندو نوجوانوں میں کچھ فرقہ پرست لیڈروں نے جو زہر اسلام کے خلاف پیدا کیا ہے، اس کو ختم کرنا بہت آسان ہے۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ مسلم رہنما ردعمل کا انداز اختیار نہ کریں بلکہ مثبت انداز میں دین رحمت اور پیغمبر رحمت کا تعارف لوگوں کے سامنے لایا جائے اور ان کے لئے خدا سے دعا بھی کی جائے۔

مہاجر قومی موومنٹ (MQM) کے سابق لیڈر مسٹر الطاف حسین آجکل لندن میں رہتے ہیں۔ کیوں کہ پاکستان میں وہ غدار وطن قرار دیے گئے ہیں۔ میں نے ان سے ملاقات کرنا چاہا مگر ان سے ربط قائم نہ ہو سکا۔ الطاف حسین پاکستان کی پراسرار شخصیتوں میں سے ایک ہیں۔ لاہور کے ماہنامہ میثاق (جون ۱۹۹۴) میں ان کی بابت حسب ذیل الفاظ چھپے ہوئے تھے۔

" افواہ گرم ہے اور بہت وثوق سے بتایا جاتا ہے کہ الطاف حسین نے لندن میں اپنی رہائش کے لئے بیالیس لاکھ پونڈ اسٹرلنگ کا مکان خرید رکھا ہے۔ نیو یارک میں پانچ کروڑ ڈالر میں خریدا ہوا ان کا ہوٹل شب و روز مال بنا رہا ہے۔ اور یہ کہ ان کے پاس نقد موجود رقم کی مالیت دس ارب روپیہ ہے۔ ایم کیو ایم کا سازشی عنصر نیو ورلڈ آڈر کے لئے ہانگ کانگ کا متبادل تیار کرنے کے لئے کراچی کو سندھ سے کاٹنا چاہتا ہے"۔ صفحہ ٦

لندن سے ایک ہفت روزہ انگریزی اور گجراتی زبان میں شائع ہوتا ہے۔ اس کا نام گراوی گجرات (Garavi Gujrat) ہے۔ اس نے اپنی دو اشاعتوں میں میرے مضامین شائع کئے اور ان کو جلسہ میں تقسیم کیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے انٹرویو بھی لیا۔

لندن کے فیسٹول میں مذاہب کے جو ذمہ دار افراد شریک ہوئے، ان میں سے ایک اکال تخت (امرتسر) کے چیف جتھے دار پروفیسر منجیت سنگھ بھی تھے۔ وہ چوں کہ معتدل اور امن پسند آدمی ہیں، ان کے خلاف انتہا پسند سکھوں کی طرف سے یہ خبر پھیلائی گئی کہ ان کو لندن کی

کانفرنس میں ایک سازش کے تحت بلایا گیا تھا تاکہ لندن میں مقیم سکھ انتہا پسندوں کو مین اسٹریم میں لایا جائے اور خالصہ تحریک کو سبوتاژ کیا جاسکے۔ اس مقصد کے لئے را (RAW) نے ان کو بیرونی کرنسی میں ایک کروڑ روپیہ سے زیادہ (Rs. 1.5 crore) کی رقم ادا کی ہے۔ ٹائمس آف انڈیا (۲۲ اگست ۱۹۹۴) کی ایک رپورٹ کے مطابق، چیف جتھے دار نے اس کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ ان کا یہ سفر سکھ ازم کے پرچار کے لئے تھا:

He clarified that his visit was to propagate Sikhism.

پروفیسر منجیت سنگھ کے سفر کو دو رخ سے دیکھا جاسکتا تھا۔ ایک یہ کہ وہ دوسروں سے لینے کے لئے گئے ہیں اور دوسرے یہ کہ وہ دوسروں کو دینے کے لئے وہاں گئے ہیں۔ سکھ نوجوانوں نے ان کے سفر کو پہلے رخ سے دیکھا اس لئے وہ غلط فہمی میں پڑ گئے۔ اگر وہ ان کے سفر کو دوسرے رخ سے دیکھتے تو وہ خوش ہوتے اور ان کی مذمت کرنے کے بجائے ان کو مبارک باد کا ٹیلیگرام بھیجتے۔

برطانیہ کے ایک عام آدمی سے ملاقات ہوئی۔ گفتگو کے دوران اس نے ایک لطیفہ سنایا۔ اس نے بتایا کہ مسٹر ونسٹن چرچل جب پرائم منسٹر نہیں ہوئے تھے، اس وقت ان کا بی بی سی پر ریگولر پروگرام ہوا کرتا تھا۔ ایک روز چرچل کا پروگرام تھا۔ وہ گھر سے نکلے تو کچھ دیر ہوگئی تھی۔ انھیں فوراً بی بی سی کے آفس میں پہنچنا تھا۔ انھوں نے ایک ٹیکسی والے کو آواز دی۔ اس نے منع کر دیا۔ اس نے کہا کہ اس وقت مجھے فوراً گھر پہنچنا ہے اور وہاں چرچل کو سننا ہے۔ چرچل نے اپنا نام نہیں بتایا۔ انھوں نے کہا کہ مجھ کو بی بی سی کے دفتر پہنچا دو، میں تم کو ستر پونڈ دوں گا۔

ستر پونڈ اصل کرایہ سے دس گنا زیادہ تھا۔ ٹیکسی والے نے جب ستر پونڈ کا لفظ سنا تو بولا: چرچل بھاڑ میں جائے۔ آؤ میں تم کو لے چلتا ہوں:

Let Churchill go to hell. Come on.

ایک اور برطانی آدمی سے ایک بار بات ہو رہی تھی۔ کسی معاملہ میں وہ اپنے نقطۂ نظر کو بتا رہا تھا۔ اس درمیان میں بے ساختہ طور پر اس کی زبان سے نکلا:

It is a far cry to London.

مجھے یاد آیا کہ یہ "ہنوز دلی دور است" کا انگریزی استعمال ہے۔ زبانوں میں یہ یکسانیت

غالباً دو وجہ سے آتی ہے۔ ایک یہ کہ تمام تصورات یکساں طور پر ہر آدمی کی فطرت میں پیوست ہیں۔ اور وہ اندرونی زور پر لفظ کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ انسانی اختلاط کے دوران زبانوں میں برابر لین دین کا عمل جاری رہتا ہے۔ پہلی چیز عالمی لسانی یکسانیت کی داخلی توجیہ ہے اور دوسری چیز لسانی یکسانیت کی خارجی توجیہ۔

دہلی کے اردو ہفت روزہ الجمعیۃ (۴ - ۱۰ فروری) میں ایک رپورٹ چھپی تھی۔ اس کا عنوان تھا: ہندستانی فرقہ پرستی کی ہوا دیارِ فرنگ تک پہنچی۔ اس رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ لندن کے علاقہ ساؤتھ آل میں قدیم ٹاؤن ہال کو نیلام کرنے کا اعلان کیا گیا۔ مسلمانوں نے اس کو مسجد کے لئے لینا چاہا۔ مگر فرقہ پرستی کا زہر ہندستان سے سفر کر کے لندن تک پہنچ چکا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کی ضد میں ہندوؤں نے اعلان کر دیا کہ وہ ٹاؤن ہال کو خرید کر وہاں شاندار مندر تعمیر کریں گے۔ نیلام کے دن دونوں فرقوں کی طرف سے بڑھ بڑھ کر بولیاں لگائی گئیں۔ کونسل نے مزید رقم کی امید میں تاریخ بڑھا دی جو کہ ضابطہ کے خلاف تھی۔ اس کے بعد معاملہ عدالت تک پہنچ گیا۔ ہندوؤں کا مقصد مندر کی تعمیر نہیں ہے بلکہ صرف مسجد کی تعمیر کی مخالفت کرنا ہے۔ اسی طرح کونسل کا مقصد یہ ہے کہ اپنی جائداد کو اونچی سے اونچی قیمت پر فروخت کرے۔

یہ ایک عجیب رپورٹ تھی۔ لندن میں میں نے چاہا کہ اس کی تحقیق کروں۔ معلوم ہوا کہ یہ محض ایک سادہ سا مسئلہ تھا جس کو دہلی کے اردو اخبار نے مبالغہ آرائی کر کے اشتعال انگیز بنا دیا۔ چنانچہ اس وقت یہ عمارت مسلمانوں کے قبضہ میں ہے۔ وہاں باقاعدہ نماز ہوتی ہے اور اس کی تعمیر جدید کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ اس مسئلہ پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان یہاں کوئی نزاع نہیں۔

انگلینڈ میں تعلیم کی نہایت آسانی ہے۔ پہلی جماعت سے لے کر ایم اے، پی ایچ ڈی تک ساری تعلیم ذاتی خرچ کے بغیر حکومت کی مدد سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ مگر بیشتر لوگ صرف ۱۶ سال کی عمر تک پڑھ پاتے ہیں، کیوں کہ اس عمر تک کے لوگوں کے لئے پڑھنا قانونی طور پر لازمی ہے۔ طلبہ کی ۱۰ فیصد تعداد ہی یونیورسٹی تک پہنچ پاتی ہے۔ انگریزوں میں یونیورسٹی تک پہنچنے والے بچوں کی تعداد صرف سات فیصد ہے۔

۱ آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۵ فروری ۱۹۹۶ کو صدر اسلامی مرکز کا ایک انٹرویو نشر کیا گیا۔ یہ انٹرویو زیادہ تر اسلامی مرکز کے بارہ میں تھا۔ اس میں بتایا گیا کہ اسلامی مرکز کا مقصد کیا ہے اور کس طرح وہ پر امن انداز میں اس مقصد کے راستہ میں لگا ہوا ہے۔

۲ انڈیا پلس ٹی وی (India Plus TV) کے اسپیشل کرسپانڈنٹ مسٹر وی پی شرمانے ۱۳ دسمبر ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا ٹی وی انٹرویو ریکارڈ کیا۔ اس کا موضوع سپریم کورٹ کا فیصلہ (۱۱ دسمبر ۱۹۹۵) تھا جس میں ہندتو یا ہندویا ہندوازم کے الکشن مہم میں استعمال کرنے کو جائز ٹھہرایا گیا۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ یہ فیصلہ یقینی طور پر غیر دستوری ہے۔ ہندتو کا لفظ سب سے پہلے ۱۹۲۴ میں ہندو مہاسبھا کے رہنما ویر ساورکر نے وضع کیا تھا۔ اس وقت سے اب تک اس لفظ کا مطلب ہندو راشٹر ہی رہا ہے۔ معروف مفہوم کے لحاظ وہ سیکولرزم کا ضد ہے۔

۳ ۳ فروری ۱۹۹۶ کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر نشر کی گئی۔ یہ تقریر عید الفطر (اسلامی تیوہار) کے بارہ میں تھی۔ اس میں بتایا گیا کہ تیوہار انسان کی ایک فطری ضرورت ہے اور عید دراصل تیوہار کی رسم کا اسلامائزیشن ہے۔

۴ انڈیا پاکستان فرینڈشپ کے تحت ۳ فروری ۱۹۹۶ کو جامعہ ملیہ (نئی دہلی) میں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک میٹنگ ہوئی۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے بھی اس میں شرکت کی۔ ان کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ دونوں ملکوں میں نارمل تعلقات قائم کرنے کی سادہ تدبیر یہ ہے کہ دونوں کے درمیان انٹرایکشن اور آنا جانا بڑھایا جائے جس طرح عرب ملکوں میں عربوں کے لئے ویزا نہیں ہے اور یورپی ملکوں میں یورپ کے باشندوں کے لئے ویزا نہیں ہے۔ اسی طرح ہندستان اور پاکستان میں بھی رائج کر دیا جائے۔

۴ ۴ فروری ۱۹۹۶ کی شام کو راجدھانی کی کچھ اعلیٰ شخصیتوں کی میٹنگ کنشکا ہوٹل (نئی دہلی) میں ہوئی۔ اس کا موضوع سیاسی اصلاحات پر غور کرنا تھا۔ اس کے داعی جسٹس

دیبی سنگھ تیوتیا تھے۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے بھی اس میں شرکت کی۔ اور اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ " پروینیج گروپ " کو جاننا چاہئے کہ سیاسی اصلاح کے دو مرحلے ہیں۔ پہلا، پولٹیکل اویرنس (سیاسی جاگ) پیدا کرنا۔ دوسرا، ہے پولٹیکل ایکشن (سیاسی اقدام) پہلا مرحلہ طے کئے بغیر دوسرے مرحلہ میں داخلہ نتیجۃً سیاسی اصلاح نہیں ہے بلکہ سیاسی بگاڑ ہے۔

۵ راجیو گاندھی فاؤنڈیشن کے تحت نئی دہلی میں ۵ - ٦ فروری ١٩٩٦ کو انڈیا۔ پاکستان ڈائیلاگ ہوا۔ جس میں دونوں طرف سے اعلیٰ شخصیتیں شریک ہوئیں۔ اس کی دعوت پر ۵ فروری کو صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور دونوں ملکوں میں تعلقات کو بہتر بنانے پر اظہار خیال کیا۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ اس معاملہ میں ایک فارمولا درکار ہے۔ اور وہ فارمولا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں موجود ہے۔ وہ فارمولا یہ ہے کہ معاملہ کے سیاسی پہلو کو اس کے غیر سیاسی پہلو سے الگ کر دیا جائے۔ سیاسی پہلو کو انتظار کے خانہ میں ڈال کر یہ کیا جائے کہ دونوں ملکوں کے درمیان آمدورفت کو بڑھایا جائے۔ تجارت کھول دی جائے۔ تعلیم کے لئے دونوں طرف آنا جانا شروع کر دیا جائے۔ اس سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی سے مثالیں دیکر اس کو واضح کیا گیا۔

٦ آکاش وانی نئی دہلی (ہندی وارتا) سے ١٩ فروری ١٩٩٦ کو صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر نشر کی گئی۔ اس کا عنوان تھا: عید: میل ملاپ کا تیوہار۔

۷ دہلی کے ہندی میگزین کرنٹ ادیوگ کے سب اڈیٹر راکیش کھتر نے ٢٢ فروری ١٩٩٦ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر ملکی مسائل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ ملکی مسائل کی جڑ یہ ہے کہ ہمارے یہاں میں تعلیم عام نہ ہو سکی۔ اچھے تعلیم یافتہ ابھی تک ١٠ فیصد بھی نہیں ہیں۔ جب تک تعلیم عام نہیں ہوگی اس وقت تک محض وقتی تدبیروں سے کوئی مسئلہ حل ہونے والا نہیں۔

۸ دہلی کے قریب بھونڈسی (Bhondsi) میں واقع چندرشیکھر آشرم میں ٢٤ - ٢٥ فروری

۱۹۹۶ کو ایک آل انڈیا سمینار ہوا۔ اس میں تقریباً ۹۰ کی تعداد میں اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد شریک ہوئے۔ اس کا ایجنڈا نیشن بلڈنگ تھا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور اپنے خیالات پیش کئے۔ تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ ملک کے جو مسائل ہیں وہ کسی وقتی تدبیر سے حل نہیں ہو سکتے۔ تمام مسائل کی جڑ تعلیم کی کمی ہے۔ اس لئے سب سے پہلا کام یہ ہے کہ عمومی سطح پر لوگوں کو تعلیم یافتہ بنایا جائے۔

۹ دہلی سے نکلنے والے ملیالم اخبار نئی دہلی انو (New Delhi Innu) کے ایسوسی ایٹ اڈیٹر مسٹر راجیش (Rajesh Chombala) نے ۲۵ فروری ۱۹۹۶ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر ملکی مسائل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ الکشنی تبدیلیوں سے ملک میں کوئی انقلاب آنے والا نہیں۔ تعمیری انقلاب کے لئے لمبی مدت تک کام کرنا پڑے گا۔

۱۰ سنٹر فار پیس اینڈ پراگرس کی طرف سے ۲۹ فروری ۱۹۹۶ کو انڈیا انٹرنیشنل سنٹر میں ایک سمینار ہوا۔ اس کا عنوان تھا: ریلیجن اینڈ پالی ٹکس۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور موضوع پر اپنا نقطۂ نظر پیش کیا۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ سیاسی اغراض کے لئے مذہب کا اکسپلائٹیشن غلط ہے۔ لیکن اگر مذہب کی اخلاقی قدروں کو سیاست پر منطبق کیا جائے تو یہ ایک درست بات ہوگی۔

۱۱ بزنس انڈیا ٹیلیویژن انٹرنیشنل کی ٹیم نے یکم مارچ ۱۹۹۶ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو ریکارڈ کیا۔ اس کا تعلق ہندستانی مسلمانوں کے مسائل اور ان کی انتخابی پالیسی سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ ہندستانی مسلمانوں کے تمام مسائل کی واحد ذمہ داری ان کے نااہل لیڈروں پر ہے۔ اگر یہ نام نہاد لیڈر چپ رہتے تو کبھی ہندو اور مسلمان کی کشمکش پیدا نہ ہوتی۔ فطرت کے قانون کے تحت دونوں مل جل کر رہتے اور ترقی کرتے۔

۱۲ دنیش شرما اور ان کی ٹیم نے ۸ مارچ ۱۹۹۶ کو دور درشن کے لئے صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر کشمیر کے مستقبل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب

میں کہا گیا کہ ہندستان اور پاکستان کو چاہئے کہ اس معاملہ کو شملہ ایگریمنٹ کی روشنی میں طے کریں جس پر دونوں ملکوں کے رہنماؤں نے ۱۹۷۱ میں دستخط کئے تھے۔

۱۳ صدر اسلامی مرکز نے ۹ ـ ۱۱ مارچ ۱۹۹۶ کو مراد آباد کا سفر کیا۔ وہاں مختلف قسم کے پروگرام اور ملاقاتیں ہوئیں۔ ہندی اخبار امر اجالا کے نمائندہ نے تفصیلی انٹرویو لیا جو اخبار کے ۱۱ مارچ کے شمارہ میں چھپا۔ اس سفر کی روداد ان شاء اللہ سفرنامہ کے تحت الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

۱۴ ہفت روزہ نئی دنیا کے نمائندہ مسٹر ودود ساجد نے ۱۳ مارچ ۱۹۹۶ کو ٹیلیفون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق اس خبر سے تھا کہ ایران کی حکومت نے سلمان رشدی کے قتل کے فتوے کو واپس لے لیا ہے۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ یہ واپسی یقیناً قابل تعریف ہے، تاہم ضرورت ہے کہ اسی کے ساتھ یہ اعتراف کیا جائے کہ یہ ایک لغو فتوی تھا۔ اسلام میں کسی جرم پر سزا کا مسئلہ قضا (عدالت) کا مسئلہ ہے، وہ کسی انفرادی عالم کے فتوے کا مسئلہ نہیں۔ اس لئے اس کا بھی اعلان کیا جانا چاہئے کہ آئندہ ایسی جسارت کبھی نہیں کی جائے گی۔

۱۵ راشٹریہ جاگرتی سنستھان کے تحت ۱۵ مارچ ۱۹۹۶ کو انڈیا انٹرنیشنل سنٹر (نئی دہلی) میں ایک سیمینار ہوا جس میں اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد شریک ہوئے۔ اس کا مقصد ترجیحی بنیاد پر نیشنل ایجنڈا تلاش کرنا تھا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور اپنا نقطۂ نظر پیش کیا۔ انھوں نے بتایا کہ موجودہ حالات میں اہم ترین اشو یہ ہے کہ دستور ہند کی دفعہ ۴۵ کے تحت عمومی تعلیم کو قومی نشانہ بنایا جائے، یہاں تک کہ پوری قوم صد فی صد تعلیم یافتہ ہو جائے۔

۱۶ وائلٹ گراف (Violette Graff) فرانس کی ایک خاتون پروفیسر ہیں۔ وہ پیرس میں رہتی ہیں۔ (Tel. 1-43364153) اور ہندستانی مسلمانوں پر ریسرچ کر رہی ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے ۱۸ مارچ ۱۹۹۶ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ آخر میں انھیں انگریزی الرسالہ اور انڈین مسلمس بطور ہدیہ دی گئی۔

اُردو

	Rs.
تذکیر القرآن جلد اول	200/-
تذکیر القرآن جلد دوم	200/-
اللہ اکبر	45/-
پیغمبرِ انقلابؐ	50/-
مذہب اور جدید چیلنج	45/-
عظمتِ قرآن	35/-
عظمتِ اسلام	50/-
عظمتِ صحابہ	7/-
دینِ کامل	60/-
الاسلام	45/-
ظہورِ اسلام	50/-
اسلامی زندگی	30/-
احیاءِ اسلام	35/-
رازِ حیات	50/-
صراطِ مستقیم	40/-
خاتونِ اسلام	60/-
سوشلزم اور اسلام	40/-
اسلام اور عصرِ حاضر	30/-
الربانیہ	40/-
کاروانِ ملت	45/-
حقیقتِ حج	30/-
اسلامی تعلیمات	25/-
اسلام دورِ جدید کا خالق	25/-
حدیثِ رسولؐ	35/-
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار)	85/-
سفرنامہ (ملکی اسفار)	—
میوات کا سفر	35/-
قیادت نامہ	30/-
راہِ عمل	25/-
تعبیر کی غلطی	70/-
دین کی سیاسی تعبیر	20/-
امہات المومنین	20/-
عظمتِ مومن	7/-
اسلام ایک عظیم جدوجہد	3/-
طلاق اسلام میں	3/-

تاریخ دعوت حق	5/-
مطالعۂ سیرت	12/-
ڈائری جلد اول	80/-
کتاب زندگی	55/-
انوارِ حکمت	—
اقوالِ حکمت	25/-
تعمیر کی طرف	8/-
تبلیغی تحریک	20/-
تجدیدِ دین	25/-
عقلیاتِ اسلام	35/-
مذہب اور سائنس	—
قرآن کا مطلوب انسان	8/-
دین کیا ہے	5/-
اسلام دین فطرت	7/-
تعمیرِ ملت	7/-
تاریخ کا سبق	7/-
فسادات کا مسئلہ	5/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	5/-
تعارفِ اسلام	5/-
اسلام پندرھویں صدی میں	5/-
راہیں بند نہیں	12/-
ایمانی طاقت	7/-
اتحادِ ملت	7/-
سبق آموز واقعات	7/-
زلزلۂ قیامت	10/-
حقیقت کی تلاش	7/-
پیغمبرِ اسلام	5/-
آخری سفر	7/-
اسلامی دعوت	7/-
خدا اور انسان	12/-
حل یہاں ہے	10/-
سچا راستہ	8/-
دینی تعلیم	7/-
حیاتِ طیبہ	7/-
باغِ جنت	7/-
فکرِ اسلامی	50/-

نارِ جہنم	7/-
خلیج ڈائری	10/-
رہنمائے حیات	7/-
مضامین اسلام	45/-
تعددِ ازواج	10/-
ہندستانی مسلمان	40/-
روشن مستقبل	7/-
صومِ رمضان	7/-
علمِ کلام	9/-
اسلام کا تعارف	2/-
علماء اور دورِ جدید	8/-
سیرتِ رسولؐ	10/-
ہندستان آزادی کے بعد	1/-
مارکسزم تاریخ جس کو رد کرچکی ہے	7/- 7/-
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	4/-
منزل کی طرف	2/-
الاسلام یتحدیٰ (عربی)	85/-

ھندی

سچائی کی تلاش	8/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	4/-
پیغمبر اسلامؐ	4/-
سچائی کی کھوج	10/-
آخری سفر	8/-
اسلام کا پریچے	8/-
پیغمبر اسلام کے مہان ساتھی	8/-
راستے بند نہیں	7/-
جنت کا باغ	8/-
بہو پتنی واد اور اسلام	10/-
اتہاس کا سبق	9/-
اسلام ایک سوابھاوک مذہب	8/-
اجول بھویش	8/-
پوتر جیون	8/-
منزل کی اور	3/-

God Arises	Rs. 95/-
Muhammad: The Prophet of Revolution	85/-
Islam As It Is	55/-
God-Oriented Life	70/-
Religion and Science	45/-
Indian Muslims	65/-
The Way to Find God	20/-
The Teachings of Islam	25/-
The Good Life	20/-
The Garden of Paradise	25/-
The Fire of Hell	25/-
Man Know Thyself	8/-
Muhammad: The Ideal Character	5/-
Tabligh Movement	25/-
Polygamy and Islam	8/-
Words of the Prophet Muhammad	75/-
Islam: The Voice of Human Nature	30/-
Islam: Creator of the Modern Age	55/-
Woman Between Islam And Western Society	95/-
Woman in Islamic Shari'ah	65/-
Hijab in Islam	20/-
Concerning Divorce	7/-

آڈیو کیسٹ

	Rs.
حقیقتِ ایمان	25/-
حقیقتِ نماز	25/-
حقیقتِ روزہ	25/-
حقیقتِ زکوٰۃ	25/-
حقیقتِ حج	25/-
سنتِ رسولؐ	25/-
میدانِ عمل	25/-
رسول اللہؐ کا طریق کار	25/-
اسلامی دعوت کے جدید امکانات	25/-
اسلامی اخلاق	25/-
اتحادِ ملت	25/-
تعمیرِ ملت	25/-
نصیحتِ لقمان	25/-

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ ہندی اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملّت کی ذہنی تعمیر میں حصّہ لینا ہے جو آج ملّت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (ہندی اور انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوّت ہے اور ملّت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو، ہندی یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زرِ تعاون الرسالہ

ہندستان کے لیے		بیرونی ممالک کے لیے	(ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال	Rs 70	ایک سال	$20 / £10	$10 / £5
دو سال	Rs 135	دو سال	$35 / £18	$18 / £8
تین سال	Rs 200	تین سال	$50 / £25	$25 / £12
پانچ سال	Rs 300	پانچ سال	$80 / £40	$40 / £18
خصوصی تعاون (سالانہ)	Rs 500	خصوصی تعاون (سالانہ)	$100 / £50	

Finest collection of books on Islam

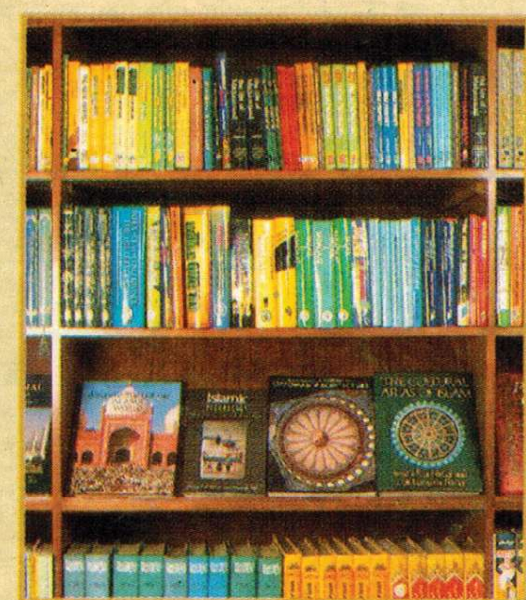

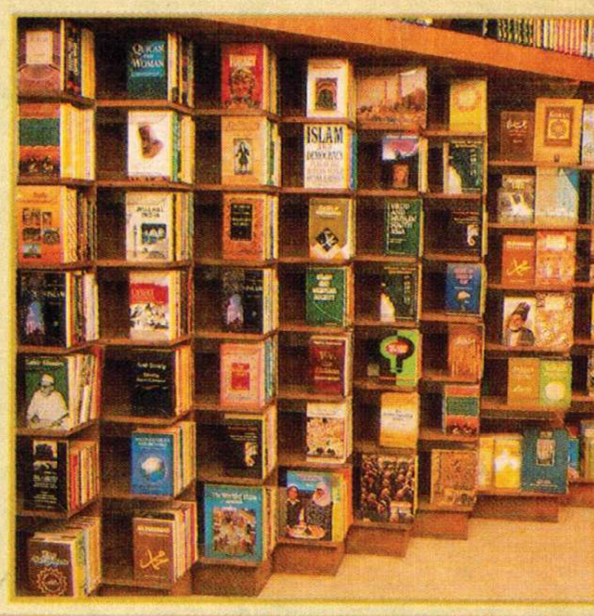

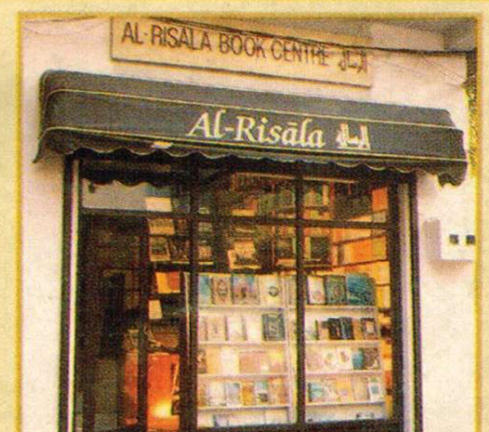

RNI 28822/76 • U(SE) 12/96
Delhi Postal Regd. No. DL/11154/96

AL-RISALA BOOK CENTRE
1, Nizamuddin West Market, Near DESU, New Delhi-110 013
Tel. 4611128, Fax 4697333